قرآن کریم اور سُنّت نبویہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسّلام کی تعلیمات کا علمبردار

بیّنات

جلد: ۸۸ شمارہ: ۳

ربیع الاول: ۱۴۴۶ھ - اکتوبر: ۲۰۲۴ء

قیمت فی شمارہ: ۶۰ روپے، زرِ سالانہ: ۷۰۰ روپے

مُدیر / مُدیرِ مسئول

مولانا سیّد سُلیمان یوسف بنوری

نائب مُدیر

مولانا سیّد احمد یوسف بنوری

مُدیرِ مُعاون

مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم

مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ''بینات''، جامعۃ العلوم الاسلامیۃ علامہ بنوری ٹاؤن

کراچی، پوسٹ کوڈ: 74800، پوسٹ بکس نمبر: 3465

فون دفتر ''بینات'': 021-34927233

بیرونِ ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

یورپ اور امریکی ممالک، وغیرہ: 40 امریکی ڈالر

عرب اور ایشیائی ممالک، وغیرہ: 35 امریکی ڈالر

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 0101900-397-7 برانچ کوڈ: 00816

مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی

وضاحت

ماہنامہ ''بینات'' میں اشتہارات کی اشاعت کا مقصد تصدیق اور سفارش نہیں ہے۔ ادارہ معاملات کا ذمہ دار نہیں ہوگا۔

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147

فیکس: 92-21-34919531 +

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری **مطبع:** شفق پرنٹنگ پریس **طابع:** حافظ ثناء اللہ واحدی

فہرستِ مضامین

بصائر وعبر

علوم وفنون کے شناور (حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ)	۳	سید سلیمان یوسف بنوری
سپریم کورٹ کا دانشمندانہ فیصلہ	۷	محمد اعجاز مصطفیٰ
یاددہانی برائے اشاعتِ خاص حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندرؒ	۱۰	ادارہ
اعلان برائے اشاعتِ خاص حضرت مولانا محمد انور بدخشانیؒ	۱۱	ادارہ

مقالات ومضامین

مکاتیبِ اکابرؒ بنام حضرت بنوریؒ	۱۲	انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری
خوارق ومعجزات اور سائنس!	۱۶	حضرت مولانا محمد بدیع الزماں رحمۃ اللہ علیہ
سراپا وفائے شیخ، جستجوئے علم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ	۲۲	مولانا ڈاکٹر احمد یوسف بنوری
مدارس رجسٹریشن ... اصل حقائق	۳۰	مولانا قاری محمد حنیف جالندھری
علومِ حدیث کی تطبیق میں اِفراط وتفریط کے مظاہر (قسط:۲)	۳۵	مولانا عبدالمالک/مولانا یاسر عبداللہ
غصہ-ایک سماجی ناسور ... نقصان اور علاج	۴۷	مولانا عبدالمتین
تجدُّد پسندی کا فتنہ اور اس کے تازہ خدوخال	۵۲	مولوی محمد احمد
معاشرہ میں عدل وانصاف ... تقاضے اور اسلامی تاریخ	۵۶	ڈاکٹر ساجد خاکوانی

دار الإفتاء

بینک کی سودی رقم کھانے پینے کے علاوہ دیگر ضروریات میں خرچ کرنے کا حکم	۶۲	ادارہ

نقد ونظر

رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم	۶۴	ادارہ

علوم وفنون کے شناور

استاذِ محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ

سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و سلامٌ علیٰ عبادہ الذین اصطفٰی

انسان کی زندگی کی تعمیر میں دیگر عوامل کے ساتھ کچھ شخصیات خضرِ راہ کا کردار ادا کرتی ہیں، میری زندگی میں بھی بعض شخصیات نے مختلف مراحل میں رہبر و رہنما کا کردار نبھایا ہے۔

استاذِ محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ بھی میری زندگی کی ان مشفق اور محسن ہستیوں میں سے تھے، جنہوں نے حضرت والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت ومحبت کا حق ادا کرنے میں انتہا کردی۔ ابتدائی طلب علمی سے وفات تک جس تسلسل وتواتر کے ساتھ ہر موقع پر میری سرپرستی اور راہنمائی فرماتے رہے، اسے ایک مشفق والد کی پشتی بانی اور دست گیری سے تعبیر کرنا بے جا نہ ہوگا۔ انہوں نے تربیت وتعلیم سے لے کر عملی وانتظامی ذمہ داریوں تک، ہر موقع پر رہبری فرمائی، اوائلِ عمر سے علمی نشوونما کی نگاہ داشت کی، درسِ نظامی کے دوران مطالعہ ودیگر تعلیمی اُمور کے ساتھ جزوی مسائل میں بھی رہبری کرتے رہے، اور جامعہ میں میری انتظامی ذمہ داریوں کی تجویز اور انہیں قبول کرنے پر آمادگی کا ذریعہ بھی بنے۔ استاذِ محترم ان شخصیات میں سرِفہرست تھے، جن کی جہدِ مسلسل نے ادارے کو حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی فکر وذوق سے جوڑے رکھا۔ نصاب ونظامِ تعلیم اور اسالیبِ تدریس وتصنیف وتالیف پر تو انہیں دست گاہ حاصل تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے

انہیں راست فکری، اور شرحِ صدر کے ساتھ بروقت درست فیصلہ تک رسائی کی صلاحیت عطا فرمائی تھی۔

حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مجلسِ شوریٰ کی صدارت اور جامعہ کے اہتمام کے لیے استاذِ محترم مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کا خیال پختہ تھا، لیکن انہوں نے یہ عزم کیا ہوا تھا کہ اپنی زندگی میں یہ ذمہ داری حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے وارثین کے حوالے کردوں، اور بندہ اور عزیزم مولانا سید احمد بنوری کے ناتواں کندھوں پر اس ذمہ داری کا بوجھ ڈال کر گویا وہ خود کو اپنی ذمہ داری سے فارغ اور سرخرو سمجھ رہے تھے، لیکن ہم نے ہمیشہ انہی کو بڑا سمجھا، مجلسِ شوریٰ کی صدارت درحقیقت انہی کی ہوتی تھی، اور زندگی کے آخری لمحات تک وہی ہمارے سرپرست رہے، اس لیے ان کی وفات کے موقع پر ایک بار پھر یتیمی کا احساس ہو رہا ہے، ان کی وفات ذاتی طور پر ہمارے لیے بھی بڑا سانحہ ہے، اور جامعہ کے لیے بھی۔

اہتمام وانصرام کے اس طویل دورانیے میں انتظامی نوعیت کے بہت سے اُمور کے حوالہ سے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو وہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی نسبت کی بنا پر میری معروضات کی لاج رکھتے رہے، وہ نسبتوں کے امین تھے اور نسبتوں کی رعایت بھی رکھتے تھے۔

استاذِ محترم گوناگوں علمی وعملی اوصاف وکمالات کے حامل تھے۔ جامعہ میں دورہ حدیث اور تخصص کے درجات میں طویل عرصہ نہایت دلجمعی سے اہم کتابوں کی تدریس فرماتے رہے، بلکہ ان کی تدریس کا دائرہ اس سے بھی وسیع رہا، اللہ تعالیٰ نے انہیں حرمین شریفین کی زیارت اور وہاں قیام کا ذوق وشوق عطا فرمایا تھا، ان کی آرزو تھی کہ زندگی کے آخری ماہ وسال حرمین میں حدیثی اشتغال کے ساتھ گزریں، اور ہر سال حرمین میں حاضر ہوتے اور بعض سالوں میں کئی کئی ماہ قیام پذیر رہے، اس دوران مدینہ طیبہ کی ایک مسجد میں ان سے استفادہ کے لیے درسِ حدیث کی مجلسیں قائم ہوتیں اور ان مجالس میں عرب وعجم کے اہلِ علم شریک ہوتے رہے، ان مجالس میں صحیح بخاری ودیگر کتبِ حدیث کے دروس جاری رہے، اہلِ علم ان سے مستفید ہوتے رہے اور استاذِ محترم کا تدریسی فیض عالمِ اسلام میں پھیلتا رہا، مزید براں تحقیق وتالیف کی سرگرمیوں کے ساتھ جامعہ میں جاری تحقیقی کاموں کی سرپرستی فرماتے رہے۔ کشف النقاب عما يقوله الترمذي: وفي الباب، الإتحاف لمذهب الأحناف، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے افاداتِ بخاری اور دیگر کاموں میں ان کی سرپرستی، توجہات، اور قیمتی آراء وتجاویز ہمیشہ شاملِ حال رہیں، بلکہ میری انتظامی ذمہ داریوں کے ابتدائی دنوں میں وہی جامعہ میں تحقیقی کاموں کے احیاء کے محرک رہے۔

نیز ان کی تالیفات سے پاک وہند اور دیگر بہت سے ملکوں کے اہلِ علم وطلبہ علم مستفید ہو رہے ہیں، بعض کتابیں مختلف مدارس وجامعات کے نصاب میں شامل ہیں، ان کا فارسی ترجمہ قرآن ''مجمع

الملك فهد'' (سعودی عرب) سے شائع ہوکر ہر سال ہزاروں حجاج کرام وزائرین میں تقسیم ہوتا ہے اور انہیں فیضاب کررہا ہے۔ فارسی زبان میں تفسیر بھی مکمل کرچکے تھے، ان شاء اللہ وہ بھی عنقریب شائع ہوگی۔ نیز وسطی ایشیاء کی مختلف ریاستوں اور دیگر ممالک کی جانب ان کے اسفار بھی بار بار ہوتے رہے۔ ان ممالک کے عوام وخواص میں ان کا فیض عام ہوتا رہا۔ غرض تعلیم وتربیت، تصنیف وتالیف اور اصلاح وارشاد سبھی شعبے ان کی خدمات کا دائرہ کار رہے۔ ان کے متنوع کاموں اور ذمہ داریوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ کیا ایک انسان اتنی خدمات سرانجام دے سکتا ہے؟!

استاذِ محترم نے نہایت سادہ وجفاکش زندگی گزاری، شہر کے ایک پوش علاقہ میں رہائش پذیر تھے، لیکن دوسری اہلیہ محترمہ کی وفات کے بعد جامعہ میں قیام کو ترجیح دیتے ہوئے اساتذہ کرام کی رہائشی عمارت میں منتقل ہوگئے۔ صاحب زادے عزیزم مولانا عمرانور بدخشانی نے اپنی رہائش گاہ میں ان کے لیے مستقل حصہ مختص کردیا تھا اور بارہا درخواست کرتے رہے کہ آپ اس مکان میں منتقل ہوجائیں، لیکن انہوں نے جامعہ میں ہی رہائش اختیار فرمائی، اور تادمِ آخر یہیں رہائش پذیر رہے۔ چاہتے تو اپنے اور اپنی اولاد کے لیے بہت کچھ بناسکتے تھے، لیکن ہمیشہ ''اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰہِ'' کا مصداق بن کر زندگی گزاری، خود بھی علمی وتالیفی کاموں میں مشغول رہے اور اولاد کو بھی اسی رُخ پر ڈال گئے، مولانا عمرانور اور مولانا انس انور ان کے نقشِ قدم پر گامزن ہیں اور چھوٹے صاحب زادے احمد انور بھی تعلیمی سلسلے جاری رکھے ہوئے ہیں، اللہ تعالیٰ انہیں بھی حضرت کا علمی وارث بنائے اور اُمید ہے کہ ان شاء اللہ! ساری اولاد اُن کے لیے ذخیرۂ آخرت ہوگی۔

استاذِ محترم فنافی العلم تھے، ان کی تمام زندگی علمی سرگرمیوں میں بسر ہوئی، ہمیشہ صحت اچھی رہی، زندگی کے آخری عرصے میں اگرچہ ظاہری اعتبار سے مختلف بیماریوں اور جسمانی کمزوری کا شکار ہوگئے تھے، لیکن اس کے باوجود ذہن وحافظہ تر وتازہ رہا، اور آخر تک قابلِ رشک علمی استحضار حاصل رہا۔ عزیزم مولانا عمرانور راوی ہیں کہ:

> ''آخری دنوں میں اس مسئلہ پر تحقیق کررہے تھے کہ انسان کی وفات کے بعد روح کا مستقر کیا ہوگا؟! فرمانے لگے کہ: میں نے اس مسئلہ کی بہت تحقیق کی اور غور وفکر کے بعد معارف القرآن میں مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ کی ذکرکردہ علیّین اور سجّین کی تحقیق سے مجھے اطمینان ہوا ہے۔''

استاذِ محترم کے داماد، جامعہ کے استاذ اور میرے ہم درس ساتھی مولانا فیصل خلیل زید مجدہٗ کی روایت ہے کہ: ''وفات سے تین روز پہلے حاضر ہوا، تو دریافت فرمایا: اس سال کونسی کتابیں زیرِ تدریس ہیں؟ دیگر

کتابوں کے ساتھ ’’توضیح‘‘ کا ذکر آیا اور میں نے بتایا کہ وفاق المدارس نے اب ’’تلویح‘‘ کو نصاب سے خارج کر کے مکمل ’’توضیح‘‘ کو داخلِ نصاب کر دیا ہے۔ اس فیصلے پر خوشی ومسرت کا اظہار کیا، اور خوش آئند قرار دیا، اور اصولِ فقہ میں ’’توضیح‘‘ کو اہم کتاب قرار دیا۔ اور علامہ تفتازانی رحمۃ اللہ علیہ اور ’’تلویح‘‘ کے حوالے سے اسی طرح پر مغز تبصرہ فرمایا، جیسے اپنے تر وتازگی کے دور میں فرمایا کرتے تھے، اس نوعیت کے دسیوں واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ تادمِ واپسیں ان کو علمی استحضار حاصل رہا، اور کچھ کہنے کی سکت کم ہونے کے باوجود علمی گفتگو میں مشغول رہتے تھے۔

استاذِ محترم رحمۃ اللہ علیہ گزشتہ کئی سال سے علیل تھے، اس دوران صاحب زادوں، صاحب زادیوں، دامادوں مفتی یحییٰ عاصم صاحب اور مولانا فیصل خلیل صاحب کو اُن کی خدمت کا خوب موقع ملا، اور انہوں نے علاج ودوا میں ہر ممکن کوشش کی۔ آخری ایام میں بعض ایسے واقعات اور کیفیات بھی پیش آئیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ انہیں اپنے سفرِ آخرت کا اندازہ ہوگیا تھا، اور وہ اس کے لیے پوری طرح تیار تھے۔ اور پھر وقتِ موعود پر اللہ تعالیٰ کے دربار میں حاضر ہوگئے۔ ان کی وفات کے موقع پر ذہن میں یہ روایت گردش کر رہی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جب نمازِ جنازہ ادا کرنے آتے تو یوں کہتے جاتے: ’’آپ نے امانت کی ادائیگی، امتِ مسلمہ سے خیرخواہی، اور راہِ خدا میں جہاد کا حق ادا کر دیا۔‘‘ استاذِ محترم کی طویل اور بھرپور متحرک حیاتِ مستعار اور کارناموں پر نگاہ ڈالتے ہوئے یہ گواہی بے جا نہ ہوگی کہ انہوں نے بھی اپنے اکابر خصوصاً حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل کردہ امانتوں کا حق ادا کر دیا، اپنے شیخ کی یادگار جامعہ کے خصوصاً اور اُمتِ مسلمہ کے عموماً ہمیشہ خیرخواہ رہے، اور اپنی علمی وعملی اور تالیفی تدریسی سرگرمیوں کے ذریعے راہِ خدا میں ساعی وکوشاں رہے، جزاه الله عنا وعن الأمة الإسلامية خير ما يجزي عباده الصالحين!

استاذِ محترم کے پس ماندگان میں ان کی اولاد کے ساتھ لگ بھگ پچاس سال کے طویل تدریسی دورانیے میں ان سے مستفید ہونے والے ہزاروں شاگرد اور علم سے تعلق رکھنے والے تمام طبقات ہیں، استاذِ محترم کا سانحۂ ارتحال محض ایک عالم کی وفات نہیں، بلکہ حدیثِ نبوی کے مطابق اس دنیا سے علوم اُٹھنے کا مصداق ہے، یہ سانحہ محض اولاد واقرباء اور جامعہ کے لیے صدمہ نہیں ہے، بلکہ علومِ اسلامیہ سے وابستہ ہر فرد وادارہ کا صدمہ ہے، آپ کے جانے سے علمی میدان میں جو خلا پیدا ہوا ہے، گرد وپیش کے احوال کو دیکھتے ہوئے ظاہری اسباب میں اس کا پُر ہونا دشوار محسوس ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اُن کی کامل مغفرت فرمائے، اُن کے علمی فیوض کو عام فرمائے، اور ہمیں اُن کے نقوش وآثار پر گامزن رہنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

وصلى الله تعالىٰ علىٰ خير خلقه سيدنا محمد وعلىٰ آله وصحبه أجمعين

سپریم کورٹ کا دانشمندانہ فیصلہ

ماہنامہ بینات صفر المظفر ۱۴۴۶ھ کے شمارہ میں سپریم کورٹ کے ۲۴ر جولائی ۲۰۲۴ء کے نامبارک ثانی کیس کے فیصلہ کا تجزیہ اور تبصرہ کیا گیا تھا، جو سپریم کورٹ تک بھی پہنچا۔ علمائے کرام اور اراکینِ اسمبلی کے پُرزور مطالبہ پر قومی اسمبلی کے اسپیکر کے خط اور وزیر اعظم کی ہدایت پر اٹارنی جنرل نے عدالت عظمیٰ میں درخواست دائر کی کہ چونکہ یہ مذہبی معاملہ ہے، اس لیے اس فیصلہ میں ان علمائے کرام کی آراء سنی جائیں، جنھوں نے اپنی تحریروں اور تقریروں میں اس فیصلے پر تحفظات کا اظہار کیا ہے۔

راقم الحروف کو بھی نوٹس موصول ہوا، راقم الحروف تحفظِ ختمِ نبوت کے سلسلہ میں جمعیت علماء (موریشس) افریقا کے سفر پر تھا، اس لیے بندہ کی نمائندگی عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت اسلام آباد جماعت نے کی۔ قائدِ جمعیت حضرت مولانا فضل الرحمٰن دامت برکاتہم بنفس نفیس عدالت پہنچے، جہاں پر انھوں نے چیف جسٹس سے کہا کہ ’’۷۲ سال میں‘ میں پہلی دفعہ سپریم کورٹ میں حضور ﷺ کی ختمِ نبوت کے تحفظ کے سلسلہ میں پیش ہو رہا ہوں۔ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ ترکیہ کے دورہ پر تھے، اس لیے وہ آن لائن شریک ہوئے۔ مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے دلائل دیتے ہوئے کہا کہ ہم نے نظرثانی کیس میں جو رائے دی، اس کو شاید نظر انداز کیا گیا، نظرثانی درخواستوں کے فیصلے میں کچھ قرآنی آیات کا حوالہ دیا گیا، اچھی بات ہے کہ چیف جسٹس فیصلوں میں آیات کا حوالہ دیتے ہیں۔ پیراگراف نمبر ۷ اور ۴۲ کو حذف کیا جائے۔ عدالت دفعات کا اِطلاق ہونے یا نہ ہونے کا معاملہ ٹرائل کورٹ پر چھوڑے۔ اصلاح کھلے دل کے ساتھ کرنی چاہیے۔ عدالت نے لکھا کہ قادیانی مبارک ثانی نجی تعلیمی ادارے میں معلم تھا، گویا عدالت نے تسلیم کرلیا کہ قادیانی ادارے بنا سکتے ہیں۔ عدالت نے کہا کہ قادیانی بند کمرے میں تبلیغ کر سکتے ہیں، قانون کے مطابق قادیانیوں کو تبلیغ کی کسی صورت اجازت نہیں، عدالت نے سیکشن 298-C کو مدِنظر نہیں رکھا۔ چیف جسٹس صاحب نے کہا کہ: اگر ہم وضاحت کر دیں تو کیا یہ کافی ہوگا؟ مفتی تقی عثمانی صاحب نے کہا کہ عدالت وضاحت کی بجائے فیصلے کے متعلقہ حصہ کو حذف کرے۔ چیف جسٹس صاحب نے مفتی تقی عثمانی صاحب سے کہا کہ آپ کے مطابق دو پیراگراف ختم ہونے چاہئیں، مزید کچھ کہنا چاہیں تو بتا دیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب نے کہا کہ قادیانی اقلیت میں ہیں، لیکن خود کو غیر مسلم تسلیم نہیں کرتے، قادیانیوں کو پارلیمان میں بھی نشستیں دی گئیں، جس پر اٹارنی جنرل نے کہا کہ ۲۰۰۲ء کے بعد قانون تبدیل ہو گیا اور قادیانیوں کی ایک نشست تھی جو ختم کر دی گئی، اب صرف اقلیت کی ۱۰ مخصوص نشستیں رکھی گئی ہیں۔ مفتی تقی عثمانی صاحب نے کہا کہ:

قادیانی مسلم کی بجائے اقلیت کے طور پر رجسٹرڈ ہوسکتے ہیں، اقلیت خود کو مان لیں تو پھر ان کو اقلیتوں کی نشستیں بھی مل سکتی ہیں، میرے پاس ان مسائل سے متعلق کتاب ہے، عدالت چاہے تو فراہم کردوں گا۔ اور فیصلہ کے پیراگراف ۴۹ سی کو اس طرح تبدیل کیا جائے: ''جہاں تک اس مسئلہ کا تعلق ہے کہ پیش نظر مقدمہ کے ملزم پر مجموعۂ تعزیرات پاکستان کی دفعہ: 295-B، 295-C، 298-B، 298-C کا اطلاق ہوتا ہے یا نہیں؟ ضمانت کے اس مقدمہ میں جبکہ ملزم کا ٹرائل ابھی باقی ہے، ہم یہ مناسب نہیں سمجھتے کہ اس پر کوئی فیصلہ دیں، کیونکہ ٹرائل کورٹ میں ابھی مقدمہ چل رہا ہے۔ ٹرائل کورٹ کو چاہیے کہ وہ ہمارے فیصلہ مؤرخہ ۶ رفروری ۲۰۲۴ء سے متأثر ہوئے بغیر مقدمہ کی کارروائی جاری رکھے اور تمام حالاتِ مقدمہ کو سامنے رکھتے ہوئے اس بات کا فیصلہ کرے کہ ملزم پر مذکورہ دفعات کے تحت جرم بنتا ہے یا نہیں؟ اس طرح نظر ثانی کی تمام درخواستیں جزوی طور پر منظور کی جاتی ہیں۔''

حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب کی مولانا فضل الرحمٰن صاحب نے تائید کی، عدالت نے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب سے کہا کہ: آپ آخر تک عدالت میں موجود رہیں۔ دوسرے حضرات نے بھی اپنی اپنی آراء دیں، جو کہ حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی حفظہ اللہ کی رائے سے ملتی جلتی تھیں۔ اس پر عدالت نے درج ذیل مختصر فیصلہ دیا۔ اس فیصلے کو تاریخ کے اوراق میں محفوظ کرنے کی غرض سے یہاں نقل کیا جاتا ہے:

''حکم نامہ

سپریم کورٹ کے فیصلے مؤرخہ ۲۴ر جولائی میں تصحیح کے لیے وفاق پاکستان کی جانب سے متفرق درخواست نمبر: ۱۱۱۳ بابت ۲۰۲۴ء دائر کی گئی ہے۔ اس مقصد کے لیے پارلیمان نے ایک متفقہ قرارداد بھی منظور کی تھی۔ وفاق کی درخواست میں بعض جید علمائے کرام کا نام لے کر استدعا کی گئی تھی کہ تصحیح کرتے وقت ان کی آراء کو مدِّنظر رکھا جائے۔ اس درخواست کو منظور کرتے ہوئے ان علمائے کرام کو نوٹس جاری کیا گیا۔

۲- مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ترکیہ سے، جبکہ محترم سیّد جواد علی نقوی نے لاہور سے ویڈیو لنک پر دلائل دیے۔ درج ذیل علمائے کرام نے عدالت کے سامنے بنفسِ نفیس دلائل پیش کیے:

مولانا فضل الرحمٰن صاحب، صدر جمعیت علمائے اسلام۔ مفتی شیر محمد خان صاحب، رئیس دار الافتاء دار العلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ۔ مولانا محمد طیب قریشی صاحب، چیف خطیب خیبر پختونخوا۔ صاحبزادہ ابوالخیر محمد زبیر صاحب، صدر ملّی یکجہتی کونسل۔ مولانا ڈاکٹر عطاء الرحمٰن صاحب، جامعہ اسلامیہ تفہیم القرآن، مردان۔

مفتی منیب الرحمٰن صاحب، حافظ نعیم الرحمٰن صاحب، پروفیسر ساجد میر صاحب اور مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ صاحب بوجوہ شریک نہیں ہوسکے، لیکن ان کی نمائندگی بالترتیب مفتی سید حبیب الحق شاہ صاحب،

جناب ڈاکٹر فرید احمد پراچہ صاحب، جناب حافظ احسان احمد ایڈووکیٹ سپریم کورٹ اور مفتی عبدالرشید صاحب نے کی۔

۳- علمائے کرام نے معترضہ فیصلے کے متعدد پیراگرافس پر اپنے تحفظات کا اظہار کیا اور ان کے حذف کے لیے تفصیلی دلائل دیے۔ انھوں نے اس موضوع پر اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات پیش نظر رکھنے پر بھی زور دیا۔

۴- تفصیلی دلائل سننے کے بعد وفاق کی درخواست کو منظور کرتے ہوئے عدالت اپنے حکم نامے مؤرخہ ۶ رفروری ۲۰۲۴ء اور فیصلے مؤرخہ ۲۴ رجولائی ۲۰۲۴ء میں تصحیح کرتے ہوئے معترضہ پیراگرافس حذف کرتی ہے اور ان حذف شدہ پیراگرافس کو نظیر کے طور پر پیش/ استعمال نہیں کیا جا سکے گا۔ ٹرائل کورٹ ان پیراگرافس سے متأثر ہوئے بغیر مذکورہ مقدمے کا فیصلہ قانون کے مطابق کرے۔ اس مختصر حکم نامے کی وجوہات بعد میں جاری کی جائیں گی۔ چیف جسٹس جج جج

اسلام آباد، ۲۲ راگست ۲۰۲۴ء‘‘

یہ فیصلہ علمائے کرام اور ارا کینِ اسمبلی کے اتحاد و اتفاق کی برکت سے سامنے آیا، جس پر حضرت مولانا فضل الرحمٰن نے پریس کانفرنس میں سب کا شکریہ ادا کیا، اور جمعہ کو یوم تشکر کے طور پر منانے کا اعلان کیا اور ۷ رستمبر ۲۰۲۴ء کو یوم الفتح کے طور پر منانے کے لیے مینارِ پاکستان لاہور میں ایک بڑے اجتماع کی اہمیت کو واضح کیا اور پوری پاکستانی قوم کو اس میں شامل ہونے کی ترغیب دی۔ اس فیصلے پر جہاں اُمتِ مسلمہ کو خوشی حاصل ہوئی، وہاں کچھ لبرل اور قادیانی نوازلوگوں کے پیٹ میں مروڑ اُٹھنے لگی۔

بہر حال! اچھا ہوا کہ عدالتِ عظمیٰ نے اس فیصلہ کی تصحیح کر لی، اس پر ہم جہاں عدالتِ عظمیٰ کے شکر گزار ہیں، وہاں تمام علمائے کرام، وکلاء برداری، تاجر برادری، مذہبی و سیاسی جماعتوں، مسلم عوام اور ارا کینِ اسمبلی کے بھی تہہ دل سے شکر گزار ہیں کہ سب کی جدوجہد رنگ لائی اور ایک بار پھر اللہ تعالیٰ نے حضور اکرم ﷺ کی ختم نبوت کا تحفظ کرنے والوں کو سرخرو اور کامیاب وکامران کیا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ ہمارے ملک پاکستان کی عدالتِ عظمیٰ اور تمام ملکی اداروں کی حفاظت فرمائے، ان کی عزت وتوقیر میں اضافہ فرمائے، ہمارے پیارے ملک پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدات کی حفاظت فرمائے، ملک میں امن وامان نصیب فرمائے اور معاشی و اقتصادی طور پر ملک کو مستحکم ومضبوط فرمائے، آمین بجاہ سید المرسلین و خاتم النبیین!

و صلی اللہ تعالیٰ علی خیر خلقہٖ سیدنا محمد و علی آلہٖ و صحبہٖ أجمعین

مکرر یاددہانی برائے اشاعتِ خاص

بیاد: حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ

الحمد للہ! ادارہ ماہنامہ بینات جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن نے محدث العصر حضرت بنوری قدس سرہٗ کے فرزندِ روحانی، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کے رئیس وشیخ الحدیث، عالمی مجلس تحفظِ ختمِ نبوت کے مرکزی امیر، وفاق المدارس العربیہ کے صدر، اتحادِ تنظیماتِ مدارسِ دینیہ کے سربراہ، کئی کتابوں کے مصنف ومترجم حضرت مولانا ڈاکٹر عبدالرزاق اسکندر نور اللہ مرقدہٗ کی حیات وخدمات اور ان کے علمی وعملی، تحقیقی وتصنیفی کاموں کو اُجاگر کرنے کے لیے خصوصی اشاعت کا فیصلہ کیا ہے، اہلِ علم حضرات' ڈاکٹر صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ جاوِداں کے مختلف پہلوؤں پر اپنے قیمتی مضامین سے جلد از جلد اِرسال فرمائیں۔ ادارہ قیمتی مضامین کا منتظر ہے۔ وفقکم اللہ وإیانا بالخیر

از: ادارہ بینات، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ

موبائل + واٹس اپ: 0341-3490550

پی ٹی سی ایل: 021-34927233

اوقاتِ رابطہ: صبح: 8 تا 12:30 دوپہر: 2:30 تا 4:30

ای میل ایڈریس: bayyinat@banuri.edu.pk

اعلان اشاعتِ خاص

بیاد: حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کے شیخ الحدیث، مفسرِ قرآن، جامع المعقول والمنقول، استاذ الاساتذہ، حضرت علامہ محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ (ناظمِ اول دارالعلوم کراچی) کے داماد حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً مؤرخہ ۷ رصفر المظفر ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۳ راگست ۲۰۲۴ء کو راہیِ سفرِ آخرت ہوئے، فإنا للہ وإنا إليه راجعون.

حضرت بدخشانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات حسرتِ آیات علمی دنیا کے لیے عظیم سانحہ ہے۔ آپ کی وفات، جنازہ اور تعزیت کے موقع پر دنیا بھر کے عوام وخواص شریکِ غم رہے اور یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے۔ مختلف اہلِ علم تحریری طور پر بھی اپنے جذبات کا اظہار فرما رہے ہیں، چنانچہ جامعہ کی مجلسِ منتظمہ نے مناسب سمجھا کہ حضرت بدخشانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں اس قسم کے گراں قدر جذبات اور آپ کی حیاتِ مستعار سے ملنے والے رہنما اُصولوں کو آپ کے نسبی وروحانی پسماندگان اور دیگر اہلِ علم کے لیے مشعلِ راہ بنایا جائے، اس لیے اہلِ علم اور حضرت کے متوسلین ومحبین کو مطلع کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے جذبات، خیالات اور حقیقی واقعات پر مبنی مضامین جلد از جلد ماہ نامہ ''بینات'' کے پتہ پر اِرسال فرمادیں، تاکہ حضرت بدخشانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی بے مثال قابلِ تقلید زندگی سے متعلق اشاعتِ خاص کا عمل جلد از جلد مکمل ہوسکے۔ واضح رہے کہ مضامین حقائق ونصائح پر مبنی ہوں، بے جا تکلُّف، تصنُّع اور غیر مفید لفاظی سے اجتناب کیا جائے۔ وفقکم اللہ وإيانا للخير و الصواب.

از: ادارہ بینات، جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن، کراچی

برائے رابطہ: (موبائل+واٹس اپ)0341-3490550 (PTCL:021-34927233)

اوقاتِ رابطہ: صبح: 8 تا 12:30 دوپہر: 2:30 تا 4:30

ای میل ایڈریس: bayyinat@banuri.edu.pk

سلسلۂ مکاتیب حضرت بنوریؒ

مکاتیبِ اکابرؒ

بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

انتخاب: مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

بسم اللہ الرحمن الرحیم

حضرت مولانا عبدالحق (اکوڑہ خٹک) رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

باسمہٖ تعالیٰ (۱/۱/۱۹۷۶ء)

گرامی مفاخر، فاضلِ اجل، الشیخ مولانا محمد یوسف صاحب بنوری، بورك في درجاتکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاجِ سامی بعافیت وجمعیّت باد!

حجازِ مقدّس اور افریقہ کے کامیاب دورہ سے بخیریت واپسی پر دلی مبارک باد عرض کرتا ہوں، ع:

آمین آمین لا أرضی بواحدة

حتی أضمّ إلیها ألف آمینا!

ایک تکلیف دینا چاہتا ہوں، اور وہ یہ کہ بندہ کے ایک دوست محترم نور محمد صاحب لیکچرر کالج بہاول نگر، حجازِ مقدّس کے سفر کا بہت دنوں سے والہانہ شوق رکھتے ہیں، اور یہ اس سلسلہ میں آں جناب سے تعاون کے متمنّی ہیں، اُمید ہے کہ آں محترم موصوف کے ساتھ اس نیک مقصد میں پورا تعاون فرماتے ہوئے بندہ کو ممنون فرماویں گے، وأجرکم علی اللہ تبارك وتعالیٰ!

فقط والسلام

عبدالحق غفرلہ

(مہتمم دار العلوم حقانیہ اکوڑہ خٹک)

حضرت مولانا سید اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

ذو المجد والکرم زید مجدُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید ہے کہ مزاجِ والا مع جمیع متعلقین بعافیت ہوگا، اور واپسی بھی بخیریت ہوئی ہوگی۔

جیسا کہ عرض کیا تھا مصمّم ارادہ واپسی میں کراچی حاضری کا تھا، اور جدہ پہنچ کر اتوار ۱۵/اپریل کے پی آئی اے کے پلین میں سیٹ معلوم کرنے کے لیے فرید سے بھی کہہ دیا تھا، مگر فرید نے بتایا کہ پلین ہی نہیں جائے گا۔ پھر جب کل شام کو ٹکٹ دکھایا سیٹ بک کرانے کے لیے تو معلوم ہوا کہ ''مجمع البحوث'' کے ''حجز المحل'' کرانے والے نے میرے ٹکٹ میں روٹ بھی بدلوا دیا، اور ٹکٹ پر یہ بھی لکھوا دیا کہ ائیر انڈیا کے علاوہ کسی اور کمپنی سے سفر نہیں کر سکتا، اب اس صورت میں بالکل مجبوری ہوگئی، وقت بھی زیادہ ضائع ہوگیا، اور اب ائیر انڈیا سے سیدھے بمبئی جانا ہوگا، اور کوئی شکل نہ ہو سکے گی۔ افسوس ہے کہ آپ یقیناً منتظر ہوں گے، اور احقر حسب الوعد مجبوری کی بنا پر حاضر نہ ہو سکے گا۔

مولوی عبداللہ صاحب (کاکاخیل) سلمہٗ کا ولیمہ بھی ان پر دَین (قرض) ہی رہ جائے گا، زندگی رہی تو پھر کبھی کھایا جائے گا۔ ان سے سلام فرمادیں، اور اسی طرح صاحب زادگان اور تمام پُرسانِ احوال حضرات سے سلام مسنون فرمادیں۔ دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔

فقط والسلام

اسعد غفرلہ

از مدینہ منورہ

۶/اپریل سنہ ۱۹۷۱ء

ذو المجد والکرم، مخدوم ومکرّم زید مجدُکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

اُمید ہے مزاجِ والا مع متعلقین بعافیت ہوگا۔ احقر نے ۱۲-۱۴ جون کو ایک عریضہ سنگاپور سے لکھا تھا کہ آپ کے والا نامے اور سابقہ گفتگو کی روشنی میں مناسب ہے کہ آپ خود اپنا سفیر لیبی کا خط کرنل عبدالستار امین صاحب کے پتے پر قاہرہ روانہ فرمادیں، احقر اوائلِ جولائی میں قاہرہ پہنچے گا، اس لیے یہ یقین تھا کہ مجھ کو پہنچتے ہی خط مل جائے گا، لیکن ایسا نہ ہوا۔ اور یہاں پہنچا تو آپ کا کوئی والا نامہ ان کے ہاں نہیں پہنچا ہوا ہے، ایسے احوال میں اللہ جانے سعی سے کیا حاصل ہوگا؟ اور کیا نتیجہ رہے گا؟

احقر ۳؍جولائی کی صبح کو یہاں پہنچا تھا، اور اب دو چار دن میں سیدھے طرابلس (لیبیا) یا حجاز ہوکر چلا جائے گا، اللہ مالک ہے جو اس کو منظور ہوگا، ہو جائے گا۔

خدا جانے رضائیاں آپ تک پہنچیں کہ نہیں، اور ٹھیک پہنچیں اور پسند بھی آئیں کہ نہیں، مولوی عبداللہ صاحب کاکاخیل، مولوی عبد الرزاق صاحب (اسکندر) اور تمام پُرسانِ احوال حضرات سے سلام مسنون فرمادیں، دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمائیں۔

فقط والسلام

اسعد غفرلہ

۶؍جولائی سنہ ۱۹۷۳ء

شپرڈ، قاہرہ

نوٹ: یہ مکتوب فندق شبرد (Shepheard's Hotel) قاہرہ، مصر کے لیٹر پیڈ پر لکھا گیا ہے۔

مولانا شیخ محمد رحمۃ اللہ علیہ بنام حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ

۲۲؍رمضان المبارک سنہ ۱۳۶۳ھ

از دفتر مدرسہ دار العلوم مئو

قدوۃ الأماثل حضرت مولانا المحترم مدّت فیوضکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاجِ عالی؟!

ایک اہم ضرورت سے یہ عریضہ بھیجنے کا شرف حاصل کر رہا ہوں، لیکن ابتداءً مختصر تمہید سے کر رہا ہوں، اگر بارِ خاطر ہو تو ضرورت کی اہمیت کو مدّنظر رکھتے ہوئے طوالت کو معاف فرمایا جائے۔

دار العلوم مئو تقریباً نصف صدی سے قائم ہے، اور مشرقی اضلاع کا سب سے بڑا و قدیمی مدرسہ ہے۔ اکابرینِ دیوبند کی دعا تقریراً و تحریراً ہمیشہ اس کے شاملِ حال رہی ہے۔ نیز حضرت مولانا تھانوی رحمہ اللہ کے مسلک پر عمل پیرا ہونے کی بنا پر اس مدرسہ کے فیوض اطراف و اکنافِ ہند پھیل چکے ہیں، اور سینکڑوں کی تعداد میں علماء، حفّاظ، قرّاء ہر سال بالالتزام فارغ ہوکر دستارِ فضیلت سے سرفراز ہوتے رہتے ہیں۔ ۱۷؍مدرّسین بالاستقلال تعلیمی فرائض انجام دے رہے ہیں، اور مشہور شخصیتوں کے مالک اس مدرسہ کے صدر مدرّس ہوتے

آئے ہیں۔ مولانا سید میرک شاہ صاحب کشمیری کے یکا یک گھریلو ضرورت سے مجبور ہوکر چلے جانے سے صدر مدرّس کی جگہ خالی ہوگئی ہے، اور دو سال سے کوئی اس عہدہ پر فائز نہیں ہے، صدر مدرّس کی ضرورت شدّت سے محسوس کی جارہی ہے، اور صدر مدرّس کے نہ ہونے کی وجہ سے تعلیمی نقصان کے علاوہ مدرسہ کے وقار کو سخت نقصان پہنچ رہا ہے۔ اربابِ مدرسہ اس کمی کو مدرسہ کے حق میں ناقابلِ تلافی نقصان سمجھ رہے ہیں، ’’مگر از نایابیِ آدم کار آہ آہ‘‘۔ اراکینِ مدرسہ نے بڑے غور وفکر کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ اس عہدہ کے لیے آنجناب سے زیادہ موزوں ومناسب دوسری کوئی شخصیت نہیں ہوسکتی، لہٰذا آنجناب سے پُرزور مگر مؤدبانہ درخواست ہے کہ ہماری دیرینہ اور دلی تمنا کو شرفِ اعزاز بخش کر اس دینی ادارہ کے وقار کو باقی رکھ لیں۔ جواب سے جلد سرفراز فرمایا جائے۔

والسلام

شیخ محمد غفرلہٗ

مہتمم مدرسہ دار العلوم مئو، ضلع اعظم گڑھ

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

خوارق ومعجزات اور سائنس!

حضرت مولانا محمد بدیع الزماں رحمۃ اللہ علیہ
سابق استاذِ حدیث، جامعہ

حواس وعقل کا دائرہ کار

اسلام ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے جو انسانی زندگی کے ہر گوشہ اور ہر موڑ پر انسان کی رہنمائی کرتا ہے۔ دنیا کے معاملات ہوں یا آخرت کے احوال، اسلام نے سب کی تفصیلات اور زندگی کی ہر مشکل کا قابلِ عمل حل پیش کیا ہے۔ اسلام دینِ فطرت ہے، اس لیے اس کا ہر حکم عقلِ سلیم اور فطرتِ صحیحہ کے موافق ہے۔ اگر کسی شخص کو اسلامی عقائد واعمال میں سے کوئی چیز خلافِ عقل نظر آتی ہے تو یہ دراصل اس کی عقل کا قصور ہے۔ عقل بھی تو ایک قوتِ شاعرہ ہی ہے۔ ہر حس وشعور کا دائرۂ عمل محدود ہوتا ہے۔ قوتِ باصرہ (آنکھ) ایک خاص حد تک کام کرتی ہے، اس سے آگے عاجز ہے۔ قوتِ سامعہ (کان) سے بھی ایک مخصوص حد تک استفادہ کیا جاتا ہے، لیکن اگر متکلم مخاطب سے بعید اور اس کی نگاہ سے اوجھل ہو تو نہ اس کی آواز سنی جاسکتی ہے اور نہ اس کی شکل وصورت دکھائی دیتی ہے۔ اسی بنا پر کوئی شخص اس کا دعویٰ نہیں کرتا کہ جو چیز میری نگاہ کے احاطہ میں نہیں ہے، وہ دراصل موجود نہیں ہے۔ اسی طرح عقل کا دائرۂ ادراک وشعور بھی محدود ہے، ہر چیز کو میزانِ عقل پر وزن نہیں کیا جاسکتا، عقل کی ترازو میں امورِ آخرت، حقیقت وآثارِ نبوت، ذات وصفاتِ الٰہی کی تفصیلات کو نہیں تولا جاسکتا۔ اس کی مثال ایسی ہوگی کہ کوئی شخص سونا تولنے کی ترازو (کانٹے) میں پہاڑوں کو تولنے لگے، تو لنے والے کی حماقت ہے۔ علاوہ ازیں جس طرح آنکھ میں بصارت کا مادہ اور بینائی کی قوت موجود تو ہے، لیکن وہ تاریکی میں قوتِ باصرہ سے کام لینے کے لیے خارجی روشنی کی محتاج ہے، اسی طرح عقلِ انسانی بھی ماوراء العقل اُمور کے ادراک میں وحیِ الٰہی کی محتاج ہے۔ لہٰذا اگر عقل کے ساتھ وحیِ الٰہی کا لطیف ونور آفریں تعلق باقی رہے تو اسلام کا کوئی حکم خلافِ فطرت اور خلافِ حقیقت نظر نہیں آسکتا، لیکن اگر وحیِ سماوی اور تعلق مع اللہ کا کنکشن منقطع ہوجائے تو قدم قدم پر انسانی عقل اسی طرح ٹھوکریں کھاتی ہے، جیسے اندھیرے میں بینائی کی قوت، حتیٰ کہ پیشِ پا اُفتادہ حقائق اور بدیہیات بھی اس کے لیے نظریات بن جاتے ہیں، اسی لیے شریعتِ اسلامیہ نے عقل کو علم ومعرفت

کے باب میں مختارِکل نہیں بنایا، بلکہ وحیِ ربانی کے تابع رکھ کراس سے استفادہ کرنے کا حکم دیا ہے۔

عقل مند کون؟

موجودہ دور میں ملحدینِ یورپ کی کورانہ تقلید یا جدید تعلیم وتہذیب کے مسموم اثرات کی وجہ سے مسلمانوں میں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوگیا جو اسلام کے معتقدات اور مسلمہ حقائق کو خلافِ فطرت کہہ کر ان کا مذاق اُڑاتا ہے، بلکہ سنجیدگی کے ساتھ ان پر غور کرنے اور سمجھنے کی کوشش کرنے کے بجائے اس تمسخر واستہزاء کو اپنے لیے سامانِ تفریح اور اپنی مجالس کو اس سے پُر رونق بناتا ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ یہ لوگ انتہائی وقاحت اور بے شرمی کے ساتھ اعلان کرتے ہیں کہ چونکہ یہ مسائل ہماری روشن عقل کے خلاف ہیں، اس لیے ہم اُن کو تسلیم نہیں کرسکتے، ستم ظریفی ملاحظہ ہو: جنوں کا نام خِرد رکھ لیا خرد کا جنوں

کاش! ان دشمنانِ عقل و دین سے کوئی دریافت کرے کہ تمہیں پتہ ہے کہ عقل کی حقیقت کیا ہے؟ اہلِ عقل کہلانے کے مستحق کون لوگ ہیں؟ اور کس نے تمہیں عقلاء کی فہرست میں شامل کیا ہے؟

’’برعکس نام زنگی نہند کافور‘‘ اسلام کا مذاق اُڑانے والے خداوندانِ مغرب کے نزدیک بے شک اہلِ عقل ہوسکتے ہیں، لیکن قرآن وسنت کی اصطلاح میں ان کا شمار مجانین وسفہاء بلکہ ’’أُولٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ‘‘ کے زمرہ میں ہوتا ہے، لیکن انہی مدعیانِ عقل ودانش کے سامنے اگر کوئی تاریخی واقعہ پیش کیا جائے تو اس کو تسلیم کرنے میں اُن کو کوئی تأمل نہیں ہوتا، چاہے وہ کتنا ہی بعید از عقل کیوں نہ ہو، خصوصاً اگر کسی انگریز مؤرخ یا مستشرق نے اس کو قلمبند کیا ہو تو اس کا درجہ تو اُن کے نزدیک ایمان ویقین کے لحاظ سے وحیِ ربانی سے بھی زائد ہوگا۔

مدعیانِ عقل کے تضادات

ذیل میں دو تاریخی واقعات درج کیے جاتے ہیں، جن سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ان مدعیانِ عقل وخرد کو اُن کے تسلیم کرنے میں تو کوئی کلام نہیں، لیکن اگر اس قسم کا واقعہ شریعت نے بیان کیا ہوتا تو اس میں ان دشمنانِ عقل ودین کو صدہا کیڑے نظر آتے اور صاف کہہ دیتے کہ خلافِ عقل ہے، ہم نہیں مانتے:

①- ’’ہنگری میں دو لڑکیاں پیدا ہوئیں، دونوں کے تمام اعضاء مستقل اور الگ الگ تھے، لیکن دونوں کے سرین (پچھلا حصہ) اس طرح ایک کا دوسرے سے جڑا ہوا تھا کہ دونوں کا مخرجِ براز (فضلہ نکلنے کی جگہ) ایک ہی تھی، اسی ایک راستہ سے دونوں قضاء حاجت کرتی تھیں، پیشاب گاہ الگ الگ تھی، جب ایک کو پیشاب کی حاجت ہوتی تو دوسری منقبض ہوجاتی۔ عمر کے چھٹے سال میں ایک کے اعضاء کسی مرض سے شل ہوگئے، اسی حالت میں وہ عمر بھر پھرتی رہی، لیکن دوسری کے اعضاء صحیح سالم تھے، بلوغ کی علامات بیک وقت دونوں میں ظاہر ہوئیں، جب بائیس سال کی عمر ہوئی تو ایک کو شدید بخار ہوا اور اسی مرض

میں اس کا انتقال ہوگیا، تین گھنٹہ کے بعد دوسری بھی مرگئی اور ساتھ ہی دونوں کو دفن کیا گیا۔ ‘‘

۴ - ایک چینی لڑکا جس کی عمر بارہ برس کی تھی اپنے سینہ پر دوسرا بچہ اُٹھائے ہوئے تھا، اس دوسرے بچے کا سر اُس کے سینہ کے اندر چھپا ہوا تھا، باقی دھڑ اُس کے سینہ سے گھٹنوں تک لٹکا رہتا تھا، اس بچہ میں کافی شعور تھا، ذرا سے چھونے سے وہ متأثر ہوتا اور اس سے وہ اُٹھانے والا بھی متاثر ہوتا۔ ‘‘

اس قسم کے متعدد واقعات انسائیکلو پیڈیا میں موجود ہیں، یہ مدعیانِ عقل وخرد ان کو تو بلا کسی تردُّد کے تسلیم کر لیتے ہیں، لیکن اگر خرقِ عادت کے طور پر انبیاءؑ واولیاءؒ سے کوئی اسی قسم کی خلافِ عادت چیز ظہور میں آئے تو اس میں شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں اور نہیں مانتے۔

شکوک وشبہات کی وجہ

یہ مرض دراصل وحیِ الٰہی کی عظمت کے شعور سے محروم ہونے اور ایمان کی کمزوری کا نتیجہ ہے۔ اگر خلاّقِ عالم کی قدرت پر یقین کامل ہو تو تمام ’’خوارق‘‘ (معجزات وکرامات) پر ایمان لانے میں کسی قسم کا کوئی مانع پیش نہیں آ سکتا۔ یہی وجہ تھی کہ جب معراج کا ایمان افروز واقعہ کفار نے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے سامنے پیش کیا، تا کہ ان سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرائیں تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اس میں کونسی تعجب کی چیز ہے؟! ’’ملأ اعلیٰ‘‘ سے ’’وحی‘‘ آنے پر جب میں ایمان لا چکا ہوں تو اس واقعۂ صادقہ کے تسلیم کرنے میں مجھے کیا تأمل ہوسکتا ہے؟! موجودہ پُرفتن دور میں مادہ پرستی اور خدا ورسول کی تعلیمات سے بے گانگی حد سے زیادہ بڑھ جانے کی وجہ سے معجزات وکرامات کو یہ کہہ کر رد کر دیا جاتا ہے کہ: ’’یہ چیزیں قانونِ قدرت کے خلاف ہیں اور انسانی عقل کی رسائی سے باہر ہیں، اس لیے ہم نہیں مانتے۔‘‘

معجزہ کو خلافِ قانونِ قدرت کہنا درحقیقت جہل کی دلیل ہے، ہاں! اس کی صحیح تعبیر یہ ہے کہ معجزہ یا کرامت عام قانونِ قدرت کے خلاف ہوتا ہے، اس لیے کہ اگر معجزہ عام انسانی دسترس سے باہر نہ ہو تو پھر وہ معجزہ ہی نہیں ہوسکتا۔ تاریخ کے اوراق میں بے شمار ایسے خوارق موجود ہیں جن کی صداقت پر کسی کو تردُّد نہیں ہوتا، اگر ایسے ہی خوارق کسی صاحبِ نبوت وولایت ہستی سے صادر ہوں تو اس میں کیا استحالہ ہے؟! اور ان کے قبول کرنے میں کیوں تامل ہے؟! فرانس کے مشہور فیلسوف کامل ’’فلاریون‘‘ نے اپنی کتاب ’’المجهول والمسائل الروحية‘‘ میں لکھا ہے:

’’۱- ایک عورت کا پستان بائیں ران پر تھا، وہ اس سے بچہ کو دودھ پلاتی تھی۔ ۲- جاپان میں تباہ کن زلزلہ آیا تھا جس سے کئی بستیاں تہ وبالا ہوگئیں۔ ۳: -ضلع ہردوئی میں ایک بگولا اُٹھا تھا جس سے ایک جھیل کا پانی خشک ہوگیا اور دوسری جگہ جھیل بن گئی۔‘‘

اس قسم کے خوارق کو کوئی غلط نہیں کہتا، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت

باسعادت کے موقع پر ایوانِ کسریٰ میں زلزلہ آیا، اس کے چودہ کنگرے گر گئے یا فارس کے آتش کدہ کی ہزار سالہ آگ بجھ گئی تو ان واقعات کے تسلیم کرنے میں پس وپیش ہونے لگتا ہے۔

سائنسی تحقیقات سے معجزات وکرامات کی تائید

سائنس کی محیر العقول ایجادات سے قبل تو معجزات وخوارق وغیرہ کو سمجھنے اور سمجھانے میں دقت پیش آسکتی تھی، لیکن اس سائنسی دور میں تو خوارق ومعجزات پر ایمان لانے میں کوئی اِشکال پیدا ہی نہیں ہوسکتا۔ درحقیقت سائنس کے اکتشافات نے تسلیمِ خوارق کے لیے راہ ہموار کردی۔ امام العصر حجۃ اللہ فی الارض حضرت مولانا سید انور شاہ قدس سرہٗ کا ارشاد ہے:

''اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو جو معجزات عطا فرمائے ہیں، وہ دراصل اس بات کی طرف اشارہ ہیں کہ مستقبل میں (سلسلۂ نبوت ختم ہونے کے بعد) لوگ مادی وسائل واسباب کے ذریعہ ان جیسے خوارق تک رسائی حاصل کیا کریں گے، جن کا ظہور انبیاء ورسل سے بغیر اسباب ووسائل کے ہوا تھا، تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ وقاہرہ کا ظہور ہوتا رہے۔''

حضرت سلیمان علیہ السلام کا تخت ہوا پر اُڑ کر صبح سے شام تک دو ماہ کی مسافت طے کرتا تھا، آج فضا میں ہزاروں میل فی گھنٹہ کی رفتار سے ہوائی جہاز پرواز کرتے ہیں، جو کام الیکٹرک سے ہوسکتا ہے کیا اللہ تعالیٰ اپنے نبی کی تصدیق کے لیے وہی کام بغیر الیکٹرک کے ظاہر نہیں کرسکتے ؟!

حضرت سلیمان علیہ السلام پرندوں کی بولیاں بخوبی سمجھتے تھے، جبکہ عام انسان طیور کی چہچہاہٹ کو مہمل اور بے معنی چیز سمجھتے ہیں، اس معجزہ کی نظیر بھی سائنس نے پیش کردی۔ آپ کسی پوسٹ آفس میں چلے جائیں، وہاں تار کی کٹ کٹ گھنٹوں سنتے رہیں، آپ کے نزدیک اس کی حیثیت بے معنی حرکات واَصوات (حرکتوں اور آوازوں) کی ہوگی، لیکن پوسٹ ماسٹر فوراً آپ کو بتادے گا کہ فلاں جگہ سے فلاں شخص یہ کہہ رہا ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ پھر کیوں کر انکار کیا جاتا ہے اس سے کہ صانعِ حقیقی نے نغماتِ طیور کو بھی مختلف معانی ومطالب کے اظہار کے لیے وضع کیا ہے اور اپنی قدرتِ کاملہ کے اظہار کے لیے بطورِ پیغمبرانہ اعجاز کے اپنے ایک اولوالعزم نبی کو اس کا علم عطا فرمادیا ہے۔ شبِ معراج میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا آسمانوں کا سفر کرنا اور عجائباتِ قدرت کو دیکھ کر واپس آنا، اس سرعتِ رفتار کو جٹ ہوائی جہاز اور بجلی کی رفتار یا راکٹ کی سبک رفتاری سے بخوبی سمجھا اور باور کیا جاسکتا ہے۔ موجودہ دور کے حیرت انگیز آپریشنوں نے شقِ صدر کے معجزہ کو باور کرادیا۔ معراج سے واپسی کے بعد مکہ معظّمہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیت المقدس کو بلا حجاب دیکھ کر کفار کے سوالات کا جواب دینا اس کی نظیر بھی ہمارے سامنے موجود ہے۔ دوربین یا خوردبین کے ذریعہ ایک شخص جو چیزیں دیکھتا ہے، دوسرے کو وہ اشیاء نظر نہیں آتیں، لیکن اس نظر نہ آنے کی بنا پر کوئی شخص بھی

اُن کے وجود سے انکار نہیں کرسکتا، تو اگر پیغمبر اپنی خداداد دوربین نگاہ سے بیت المقدس کا نقشہ دیکھ کر جوابات دے رہے ہوں تو اس میں کیا تعجب ہے اور کیوں اس کا انکار کیا جاتا ہے؟!

حضرت عیسیٰ علیہ السلام مٹی سے پرندہ بناکر ''نفخ'' کے ذریعہ (پھونک مارکر) اس کو ہوا میں اُڑادیا کرتے تھے، اس معجزہ کو بھی سائنس کی ایجاد نے حل کردیا۔ معدنیات کے چند مادے اور ٹکڑے ملاکر برقی طاقت کے ذریعہ ان کو راکٹ کی صورت میں بغیر پائلٹ کے ہوا میں اُڑادینا اس معجزہ کو باور کراتا ہے۔ اگر برقی طاقت کے ذریعہ جہاز یا راکٹ کو فضا میں چلایا اور کنٹرول کیا جاسکتا ہے تو کیا اللہ تعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ وقاہرہ سے بتوسطِ نفخِ عیسیٰ علیہ السلام مٹی کے پرندہ کو ہوا میں نہیں اُڑاسکتے؟!

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ آپ نے سنا ہوگا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم پشت کے پیچھے کی چیزیں اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح سامنے کی اشیاء کو ملاحظہ فرماتے تھے۔ اس معجزۂ حقہ کی حقیقت بھی اہلِ سائنس کی کاوشوں نے واضح کردی۔ ایک انگریز ماہرِ ''علمِ بصارت'' لکھتا ہے کہ انسان کے بدن کی جلد کے نیچے چھوٹے خلیے پائے جاتے ہیں جو سارے جسم میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ خلیے دراصل ننھی ننھی آنکھیں ہیں، ان میں اسی طرح سامنے کی چیزوں کا عکس پڑتا ہے اور تصویر اُترآتی ہے جس طرح آنکھ کی پتلی میں۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی پیشانی کی جلد میں بھی قوتِ باصرہ موجود ہے، یہی قوت دماغ کو پیغام پہنچاتی ہے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے درخت جھک جاتے اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سلام کرتے تھے۔ ملحدین نے اس معجزہ کا بھی مذاق اُڑایا، لیکن آج ماہرینِ علمِ نباتات نے درختوں اور پودوں کے متعلق جو حیرت انگیز انکشافات کیے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ پودوں میں دیکھنے سننے کی بھی قدرت ہے، آپس میں بات چیت بھی کرتے ہیں، ان پر عشق ومحبت اور رنج وغم کی کیفیات بھی وارد ہوتی ہیں، ان میں سے بعض میں ''ذکاوتِ حس'' کا مادہ بھی موجود ہے، بعض پودے محض چھوٹے ہی سے سکڑ جاتے ہیں اور ادنیٰ اشارے سے بند ہوجاتے ہیں، اسی ذکاوتِ حس کی وجہ سے ایک پودے کو اردو میں ''چھوئی موئی'' کہتے ہیں۔ ہندوستان کے مشہور ماہر سائنس سرجگدیش چندربوس نے طویل تجربہ وتحقیق کے بعد ایک کتاب ''پلانٹس آٹوگرافس اینڈ ویر ریویلیشن'' کے نام سے شائع کی ہے، جس میں اس نے پودوں کے متعلق نہایت حیرت انگیز معلومات جمع کی ہیں، جن کو سننے یا پڑھنے کے بعد کوئی عقل ودانش کا مالک انسان مذکورہ معجزہ سے انکار نہیں کرسکتا۔

تاریخ اسلام کا مشہور واقعہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے مدینہ میں مسجدِ نبوی کے منبر پر کھڑے ہوکر مجاہدین کے سپہ سالار ساریہ کو پکار کر کہا: ''یا ساریة الجبل!'' اسی وقت یہ آواز ساریہ کے کانوں تک پہنچ گئی، حالانکہ وہ مدینہ منورہ سے صدہا میل دور تھے۔ یہ آواز اُن تک کس طرح پہنچی؟! اس کرامتِ حقہ کو وائرلیس کی ایجاد نے حل کردیا، آج آپ وائرلیس ٹیلیفون کے ذریعہ ایک ملک سے

دوسرے ملک تک اپنی آواز پہنچا سکتے ہیں، اسی طرح فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے روحانی وائرلیس کے ذریعہ ساریہ تک اپنی آواز پہنچادی۔ عالمگیر جنگ کے زمانہ میں ایک لاسلکی پیغام میٹروگریڈ سے لندن چلا، راستہ میں بعض جرمن ماہرین اُسے جذب کرنے لگے، اوپر سے ایک فرانسیسی طیارہ نے ان پر بم پھینکا اوران کی اس کوشش کو ناکام بنادیا۔ اس واقعہ سے وحیِ آسمانی کی شہاب کے ذریعہ حفاظت کا مسئلہ بھی بآسانی ذہن نشین ہوجاتا ہے کہ عرش سے جو لاسلکی پیغام ارضِ حجاز کو جارہا ہے، شیاطین اس کو درمیان سے اُچکنا چاہتے ہیں، اوپر سے شہابِ ثاقب کا بم ان کا کام تمام کردیتا ہے۔

قرآنِ مجید میں ارشادِ ربانی ہے کہ: '' شیطان اور اس کا لشکر تم کو دیکھتا ہے، لیکن تم ان کو نہیں دیکھتے۔'' آج ٹیلی ویژن سے اس مسئلہ کو بھی بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ ٹیلی ویژن پر تقریر کرنے والے کو وہ سب لوگ دیکھتے ہیں جو اس کے سامنے ہیں، لیکن وہ ان میں سے کسی ایک کو بھی نہیں دیکھ سکتا، اس کی تقریر اوراس کی نقل وحرکت کو دوسرے دیکھتے ہیں، وہ خود اس سے عاجز ہے کہ اپنے دیکھنے والوں کو دیکھ سکے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ''مستقبل بعید'' اور ''مابعد الموت'' کے احوال تفصیل سے بیان فرمائے اور قبر اور اس کے بعد جہنم کے مہیب عذاب اورخوفناک کیفیات سے اُمت کو ڈرایا ہے، اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ''راڈر'' سے مدد لی جاسکتی ہے۔ ''راڈر'' ایک آلہ ہے جس کی مدد سے جہازوں کا نظام چل رہا ہے۔ یہی آلہ آپ کو بتاتا ہے کہ آگے کونسی چیز آرہی ہے جس سے جہاز کو نقصان لاحق ہوسکتا ہے، تقریباً سومیل سے ہی یہ آلہ بتلادیتا ہے کہ سامنے غلیظ بادل یا بلند پہاڑ آرہا ہے۔ اگر ایک بے جان آلہ مسافتِ بعیدہ کے حالات سے آپ کو مطلع کرسکتا ہے تو کیا پیغمبر کی بصیرتِ قلبی وفراستِ ایمانی مستقبل کے حالات کا اِدراک نہیں کرسکتی؟!

بعض اولیاء اللہ کے متعلق مشہور ہے کہ ہوا میں اُڑنے لگے، اس پر زائغین کو ہنسی آتی تھی کہ انسان کس طرح ہوا میں اُڑسکتا ہے، لیکن تدریجی طور پر سائنس ان تمام ناقابل فہم مشکلات کا حل پیش کررہی ہے، چند ماہ قبل اخبارات میں یہ خبر شائع ہوئی تھی کہ ''امریکہ'' میں ایک انسان کو خلائی جہاز میں سوار کرکے دنیا کے سفر پر روانہ کیا گیا، مدار پر پہنچ کر وہ سوار جہاز سے باہر نکل آیا، کئی منٹ تک فضا میں پرواز کرتا رہا، بعد میں خود ہی جہاز کے اندر چلا گیا۔ اس خبر کا تو کسی نے انکار نہیں کیا، لیکن اگر ایسا واقعہ کسی خدارسیدہ بزرگ کا بیان کیا جائے، اس میں شکوک وشبہات پیدا ہوجاتے ہیں۔

الغرض سائنس کی ترقی اور محیر العقول سائنسی ایجادات کا بغور مطالعہ کرنے سے اسلام کے بہت سے پیچیدہ مسائل اقرب الی الفہم اورقابلِ قبول ہوجاتے ہیں، اب جبکہ ہرطرف سے ایمان کی متاعِ گراں مایہ کو لوٹنے کے لیے نئے سے نئے فتنے رونما ہورہے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اسی سرکش انسان کے ہاتھوں نو بنو خارق العادۃ ایجادات ظاہر فرمارہے ہیں، تاکہ اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ وقاہرہ کو تسلیم نہ کرنے والوں پر اتمامِ حجت ہوجائے اور یہ عذر باقی نہ رہے کہ: ''إِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ''و باللہ التوفیق.

سراپا وفائے شیخ اور جستجوئے علم

خطاب: مولانا ڈاکٹر احمد یوسف بنوری
نائب رئیسِ جامعہ

حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ

بتاریخ ۷ رصفر ۱۴۴۶ھ مطابق ۱۶ راگست ۲۰۲۴ء جامعہ کے شیخ الحدیث، ورکن مجلسِ شوریٰ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کے ایصالِ ثواب کے لیے جامعہ میں طلبہ کرام نے قرآن خوانی کی، اور بعد ازاں اساتذہ جامعہ ودیگر حضرات نے حضرت مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کی حیات وخدمات پر روشنی ڈالتے ہوئے طلبہ کو نصائح فرمائیں۔ اس موقع پر نائب رئیس مولانا سید احمد یوسف بنوری مدظلہم نے پُرمغز خطاب فرمایا، جسے جامعہ کے دورہ حدیث کے طالب علم مولوی احمد شہباز نے قلم بند کیا۔ ادارہ بینات عنوانات وغیرہ کے اضافے کے بعد اس خطاب کو افادۂ عام کی غرض سے شائع کر رہا ہے۔ (ادارہ)

الحمد لله رب العالمين، والصلاة والسلام على سيد المرسلين، وعلٰى آلہٖ و صحبہٖ أجمعين، أما بعد، فأعوذ بالله من الشيطٰن الرجيم، بسم الله الرحمٰن الرحيم: ’’يَرْفَعِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنْكُمْ وَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ دَرَجٰتٍ وَ اللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ‘‘ (المجادلة:۱۱) صدق الله العظيم، وقال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : ’’إن العلماء ورثة الأنبياء.‘‘ (سنن أبي داود:۳٦٤۲) صدق رسوله النبي الكريم . اللّٰهم صل على سيدنا محمد و على آل سيدنا محمد و أصحاب سيدنا محمد.

عزیزانِ گرامی قدر! آج کے دن ہم سب اپنے استاذِ گرامی، جامعہ کے شیخ الحدیث، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے داماد، بعد ازاں حضرت مولانا نور احمد رحمۃ اللہ علیہ - جو جامعہ دار العلوم کراچی کے اولین ناظم، حضرت مولانا مفتی محمد رفیع عثمانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب دامت برکاتہم العالیہ کے استاذ تھے - ان کے داماد، محقّقِ کبیر، صاحبِ تالیفاتِ کثیرہ، شیخ الکل فی الکل، حضرت مولانا محمد انور بدخشانی -رحمه الله رحمةً

واسعةً، نوّر الله مرقدهٗ، أكرم نزلهٗ و وسّع مدخلهٗ - کی وفات حسرتِ آیات کے موقع پر جمع ہیں۔

ہماری شناخت، دین و مذہب

ہماری اور آپ کی شناخت اول وآخر مذہب ہے، ہمیں کوئی بھی صلاحیت عطا ہو، بولنے کی صلاحیت سے اللہ نے ہمیں مشرّف کیا ہو، ہمارے اندر لکھنے کی صلاحیت ہو، ہماری کوئی اور شناخت قبیلہ اور خاندان کی ہو، ان تمام چیزوں کی اَساس اگر دین اور مذہب نہیں ہے، تو نہ دنیا میں اس کا حقیقتاً کوئی فائدہ ہے، اور آخرت میں تو اس کی کوئی اُمید نہیں رکھنی چاہیے۔ اہلِ مذہب کا بنیادی مقدمہ ہی یہ ہے کہ یہ کائنات چندروزہ نہیں ہے، اس کے بعد حقیقی دنیا کا آغاز ہوگا، چناں چہ کسی شخص کی وفات سے دل میں ایک ملال کی کیفیت تو پیدا ہوتی ہے، لیکن ایک مومن کے لیے یاس اور مایوسی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''تحفة المؤمن الموت.'' (مستدرك الحاكم: ۷۹) یعنی: ''مومن کے لیے موت ایک تحفہ کی حیثیت رکھتی ہے۔''

اس پر اقبالؒ کا شعر ہے:

نشانِ مردِ مومن با تو گویم   چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اوست

''میں تمہیں کسی مردِ مومن کی نشانی بتاتا ہوں، جب موت آتی ہے تو اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی ہے۔''

اس وقت کچھ خِطّوں میں اُمتِ مسلمہ کے نوزائیدہ بچوں سے لے کر بڑی عمر کی خواتین تک روز شہادتیں ہو رہی ہیں، اور ہم اس کسمپرسی میں جینے پر مجبور ہیں، اس لیے موت کی اندوہناکی کا کیا سوال؟!

جامعہ اور شہداء جامعہ

ہمارے اساتذہ نے اشارہ کیا کہ آج اللہ نے جامعہ کو جو روحانی ترقی دی ہے، اس میں ایک اہم کردار اُن شہداء کرام کی قربانیوں کا ہے، جو جامعہ کو عطا ہوئیں، جامعہ کا معاملہ تو یہ ہے کہ دیگر اداروں کے برعکس اس کے ہر شعبہ کا شہید الگ ہے، اس کے شیخ الحدیث کے منصب پر کوئی فائز رہا ہو، یا اہتمام کے منصب پر فائز رہا ہو، دارالافتاء سے منسلک ہو، یا اور کسی شعبہ میں ہو، جیسے: مولانا قاری افتخار احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو یاد کیجیے! ہمارے جامعہ کے ہر شعبہ سے وابستہ حضرات کو اللہ تعالیٰ نے شہادتوں سے ہمکنار کیا ہے، شہداء کرام میں طلبہ کی بھی ایک الگ فہرست ہے۔ لہٰذا اُستاذِ گرامی کی وفات پر منعقد کیا جانے والا یہ تعزیتی اجتماع صرف غم واندوہ کا اظہار نہیں ہے، بلکہ شاعر کی زبان میں یوں کہیے کہ:

اَعِدْ ذِكْرَ نُعْمَانٍ لَّنَا إِنَّ ذِكْرَهٗ
هُوَ الْمِسْكُ مَا كَرَّرْتَهٗ يَتَضَوَّعُ

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائے گی محبت اُس سے
تم اِک نظر میرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ کون لوگ تھے جنہوں نے جامعہ کو جامعہ بنایا؟ وہ کون شخصیات تھیں جن کی وجہ سے اطراف و اکنافِ عالم میں کوئی ایک طالب علم بھی پہنچتا ہے، اور اپنا تعارف جامعہ کے حوالہ سے کرواتا ہے، تو لوگوں کی نگاہیں احترام سے جھک جاتی ہیں؟! ان شخصیات میں سرِفہرست ہمارے استاذ گرامی حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ تھے۔

ایک پہلو: مجسّم جستجوئے علم

حضرت مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت کا سب سے نمایاں پہلو، جس کی تعبیر کے لیے مجھے ایک اور محقق، حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے داماد، حضرت مولانا محمد طاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا جملہ یاد آتا ہے، انہوں نے حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی وفات پر جو مضمون لکھا ہے، اس میں حضرت بنوریؒ کی علمی گرویدگی کو یوں تعبیر کیا ہے کہ: ''علم کے ساتھ ان کا تعلق عینیت کا تھا، غیریت کا نہیں تھا!'' کیا اکابر تھے؟! ان کے ایک جملہ کی شرح کے لیے بھی وقت درکار ہوتا ہے! آپ طلبہ میں سے بعض علمِ کلام کے طالب علم ہیں، اور جانتے ہیں کہ علمِ کلام میں صفاتِ باری تعالیٰ کے بارے میں بحث ہوتی ہے کہ صفات؛ عینِ ذات ہیں یا غیرِ ذات ہیں؟ ہمارا اور جمہور اشاعرہ کا موقف ہے کہ صفات لاغیر و لاعین ہیں، جس کے ثبوت کے لیے ہم ''شرح عقائد'' میں بحثیں پڑھتے ہیں۔ حضرت مولانا محمد طاسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''حضرت بنوریؒ کا تعلق علم کے ساتھ عینیت کا تھا، غیریت کا نہیں تھا!'' یعنی عام قاعدہ سے ہٹ کر صفتِ علم ان کی ذات کا حصہ بن گئی تھی۔ چناں چہ اگر حضرت بدخشانی صاحبؒ کی پوری شخصیت کو ایک مختصر جملے میں بیان کرنا ہو تو یہی کہا جا سکتا ہے کہ: ''اس ہستی کا تعلق بھی علم کے ساتھ عینیت کا تھا۔''

علم سے استفادہ کا عالم یہ تھا کہ اگر ہم جیسا کوئی ناچیز یا کوئی طالب علم کتاب ہاتھ میں لے کر جا رہا ہوتا، تو اپنی تمام تر جلالتِ شان وقدر کے باوجود پوچھتے تھے کہ کون سی کتاب ہاتھ میں ہے؟ کس موضوع پر ہے؟ کتاب کو دیکھتے تھے۔ ان کے اپنے علم پر اعتماد کا عالم یہ تھا کہ ہمیں دورہ حدیث کے سال ان سے بخاری شریف (جلد دوم) پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، مجھے اور میرے ایک ساتھی (جو جامعہ میں مصروفِ خدمت ہیں) سے فرماتے: ''فتح الباري، عمدة القاري، شرح صحيح البخاري لابن بطال اور إرشاد الساري للقسطلاني کھول کر بیٹھو اور دیکھتے رہو۔'' اور دورانِ درس بعض مقامات پر فرماتے کہ: ''دیکھو! یہاں ابن حجرؒ نے یہ لکھا ہوگا، ابن بطالؒ نے یہ لکھا ہے۔'' اور کبھی اپنا قیمتی تبصرہ بھی فرماتے۔ علم کے ساتھ عینیت کے تعلق اور

مسائل کے ساتھ انہماک کا عالم یہ تھا! عرصہ ہوا مطوّلات پڑھاتے تھے، اللہ نے حدیث کی خدمت میں لگا رکھا تھا، مگر اپنے خوردوں کی تربیت کا عالم یہ تھا کہ ایک مرتبہ ان کو مقامات کا ایک نسخہ ملا، اس کا حاشیہ ان کو پسند آیا، ان کے صاحبزادے، جامعہ کے استاذ، دارالافتاء کے رکن رکین مولانا انس بدخشانی صاحب تشریف فرما ہیں، ان کو وہ نسخہ دیا اور فرمایا: ''احمد مقامات پڑھا رہا ہے، اس سے کہو اس نسخے کا مطالعہ کرے۔'' علم کے ساتھ ان کی شخصی وابستگی یہ تھی!

عزیزانِ گرامی! یہ اعتماد رکھیے کہ بند کمروں میں اکیلے بیٹھ کر کیا جانے والا مطالعہ لوگوں کو نظر آئے نہ آئے، اللہ کو نظر آتا ہے اور اس کے لیے قلوب میں راہ ہموار ہوتی ہے۔ استاذ گرامی کے اذواق مختلف تھے، عصری معلومات سے پوری طرح ہمکنار تھے، سیاسی معاملات میں اپنا خاص ذوق رکھتے تھے، اور اس سلسلہ میں وہ اتنے کوہِ گراں تھے کہ جس سیاسی موقف پر وہ جم جایا کرتے تھے، اگر تمام لوگ مخالف ہوں تب بھی وہ اپنے اس موقف سے ہٹتے نہ تھے، ایسے کئی وقت آئے مگر وہ اپنے موقف پر قائم رہے، لیکن بایں ہمہ انہوں نے اپنی شناخت' علم کے ساتھ بنائی، علم کو اپنی اساس بنایا، علم کسی کی اَساس ہو اس کی خوشبو خود مہکتی ہے، اور اس کے اثرات ہوتے ہیں۔

بہرکیف! یہ ایک طویل داستان ہے، ان کی شخصیت کے اتنے پہلو ہیں کہ اگر کسی ایک پہلو پر بات کی جائے تو دیگر جہتوں پر بات کرنے کا موقع ہی نہ ملے۔ اور سچی بات ہے مجھ جیسے ناچیز کو یارائے بیان بھی نہیں ہے، میرے اساتذہ، جو صحیح معنوں میں جبال العلم ہیں، وہ ان کی شخصیت پر روشنی ڈالیں گے۔ ایک نکتہ ذہن میں آرہا ہے، ان کا علم کے ساتھ عینیت کا حال یہ تھا، میں اس وقت طالب علم تھا، اساتذہ کرام کی دو تین دن کی تربیتی نشستیں ہوئیں، جن میں باقاعدہ طلبہ کی چھٹی کردی گئی، اور اساتذہ نے مختلف کتب وفنوں کے بارے میں تبصرہ کیا، مختلف اساتذہ نے تیاری کرکے مختلف فنون پر گفتگو کی، لیکن ہمارے جلیل القدر استاذ (مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ) کو بلاغت کے موضوع پر بات کرنے کے لیے کسی تیاری کی ضرورت نہیں پڑی، بالفاظِ دیگر اُن کو لیکچر تیار کرنے کی ضرورت پیش نہیں آئی۔ یہ ان کا ذاتی علم تھا کہ ''أسرار البلاغة'' میں یہ لکھا ہے، ''دلائل الإعجاز'' میں عبدالقاہر جرجانیؒ نے یہ لکھا ہے، علامہ تفتازانیؒ نے یہ لکھا ہے، جیسے حضرت کشمیریؒ کے بارے میں آتا ہے کہ فقہ کو چھوڑ کر ہر علم کے بارے میں وہ ذاتی تبصرہ کرتے تھے، وہ (مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ) اس قابل تھے کہ باقاعدہ شخصیات اور فنون پر تبصرہ کرتے تھے کہ تفتازانیؒ کی وجہ سے علوم میں یہ تبدیلی آئی اور فلاں کی وجہ سے یہ تبدیلی آئی۔

دوسرا پہلو: وفائے جامعہ

ایک دوسرا پہلو جو میں آپ حضرات کے سامنے رکھنا چاہتا ہوں، وہ ہے جامعہ کے ساتھ ان کی ذاتی

وابستگی، عزیزانِ گرامی! ادارے انسان بناتے ہیں، اور انسانوں کے بنائے ہوئے اداروں کو حقیقتاً وہ حیثیت حاصل نہیں ہوتی جو نصوص اور شعائر اللہ کو حاصل ہوتی ہے، یہ طے شدہ بات ہے، اس سے انکار نہیں، لیکن کوئی ادارہ اخلاص سے بنایا جائے اور بنانے والا یہ کہے کہ: ''اس کا ثواب مجھے نہیں چاہیے، رسول اکرم ﷺ کو چاہیے۔'' ایسے ادارہ کے ساتھ جو وفا کرتا ہے، ادارہ اس کے لیے اپنا سینہ کھول دیتا ہے، اور اس کا فیض دنیا میں پہنچتا ہے۔ ہماری معلومات کے مطابق حضرت مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کی جو آخری بات ہم تک پہنچی ہے، وہ یہ کہ وفات سے پہلے حضرت بنوریؒ کا تذکرہ آیا، تو فرمایا: ''حضرت نے مجھے کہا تھا: اپنی زندگی جامعہ کے لیے وقف کردو، میں نے وقف کردی۔'' آپ کے سامنے یہ بات بھی آئی ہوگی کہ ان کو قاضی القضاۃ سے لے کر دنیا کی بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں پیش کش کی گئی، لیکن انہوں نے اس کو درخورِ اعتنا ہی نہیں جانا، اور اس جامعہ سے اپنی وفا کو آخری درجہ میں نبھایا، آج بھی اگر ہم جامعہ سے استفادہ کرنا چاہتے ہیں، چاہے طالب علم ہوں یا استاذ ہوں، مجھے معذرت کے ساتھ کہنے دیجیے کہ اس ادارے کی دَر و دیوار سے وفا' حصولِ علم کے لیے شرط ہے، حضرت ڈاکٹر صاحب (مولانا عبدالرزاق اسکندر رحمۃ اللہ علیہ) پر کتنے حالات آئے، لیکن فرمایا: ''مجھے میرے شیخ (حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ) نے کہا تھا: ادارہ نہیں چھوڑنا۔'' فرمایا کرتے تھے: ''ہمارے اساتذہ جن گلیوں سے گزرے، ہم نے ان سے بھی وفا کی ہے۔'' اس جامعہ پر کئی طرح کے حالات آئے، کتنے موقعوں پر یہ گفتگو ہوچکی ہے کہ یہ مشاورت پر مبنی ادارہ ہے، حضرت بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ اس مشاورت میں دل و جان سے شریک ہوئے، ان کی اولین زیارت کا موقع مجھے اپنے گھر میں تب ملا تھا، جب ہمارے گھر میں وہ اسی نوعیت کی مشاورت میں شرکت کے لیے تشریف لاتے، جامعہ کے تمام داخلی معاملات میں وہ دلچسپی رکھتے، باقاعدہ ان میں اہمیت کے ساتھ تشریف لاتے تھے، جامعہ کے تمام فیصلوں میں شریک ہوتے تھے، مگر کسی منصب کے حصول کے بغیر، ان کے اقوال جو مجھ تک سندِ متصل کے ساتھ پہنچے ہیں، فرماتے تھے: ''میں کسی منصب کا روادار نہیں ہوں۔'' مگر جامعہ کے تمام معاملات میں دل وجان سے شریک ہوتے تھے اور آخری دم تک جامعہ سے وفا کر گئے۔ یہ اُن کی شخصیت کا دوسرا بڑا پہلو ہے، جسے ہم سب کو اہتمام کے ساتھ سامنے رکھنا چاہیے۔ یقیناً دینے والی ذات اللہ کی ہے، جو دریاؤں میں، جنگلوں میں، صحراؤں میں اللہ سے ہدایت کا طالب ہوگا اور علم کا طالب ہوگا، اس کے لیے علم کے دروازے کھلیں گے، لیکن جہاں سے استفادہ کیا جارہا ہے، جہاں رہا جارہا ہے، اگر اس کے در و دیوار کی محبت آپ کے اندر نہیں ہے، تو آپ کی شخصیت میں بڑی کمی ہے، جو ساری زندگی آپ کو محروم کرے گی۔

تیسرا پہلو: عقیدتِ شیخؒ

ان کی شخصیت کا تیسرا بڑا پہلو ہے بانیٔ جامعہ حضرت محدث العصر مولانا بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ان کی

عقیدت اور ان کے ساتھ وفا کا تعلق، ابھی میں نے آپ کے سامنے اثنائے کلام میں عرض کیا کہ صفات، عینِ ذات ہیں یا غیر ذات ہیں۔ بہر کیف! یاد رکھیے کہ ان صفات کا صدور موصوف کی ذات سے ہی ہوتا ہے، لہٰذا جس شخصیت سے آپ علم سیکھنے کے روادار ہیں، اس سے اگر آپ گہرائی کے ساتھ وابستہ نہیں ہوں گے تو سنتِ الٰہی یہی جاری ہے کہ آپ کی ترقی نہیں ہو پائے گی۔ امام ابو یوسفؒ نے جب تک خود کو امام ابو حنیفہؒ کے ساتھ وابستہ نہیں کیا، امام ابو یوسف، امام ابو یوسف نہیں بنے، ابن قیمؒ نے جب تک ابن تیمیہؒ کے ساتھ خود کو وابستہ نہیں کیا، ابن قیمؒ، ابن قیمؒ نہیں بنے، آج خود حضرت بنوریؒ کی جو شان ہے، وہ اس لیے کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت علامہ سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت میں اپنے آپ کو گم کر دیا اور کہا: ''میں کچھ نہیں، بس اپنے شیخ کے افادات کو دنیا تک پہنچانا چاہتا ہوں۔'' شخصیت کے ساتھ عقیدت کا معاملہ یہ تھا کہ کشمیر سے آئے ہوئے سیب بھی حضرت بنوریؒ کے سامنے آتے تو آبدیدہ ہو جایا کرتے تھے۔ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت بنوریؒ کی ذات کے ساتھ اپنی سچی عقیدت کو جا بجا ثابت کیا، اور ان کی بات سے بات ملائی۔

یہ بھی حسنِ اتفاق تھا کہ حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جس شخصیت کی وابستگی تھی اور ان کے علوم جنہوں نے آگے دوسروں تک پہنچائے، اس کا تعلق بھی ''بدخشاں'' سے تھا، (جن کا نام) مولانا امین بدخشیؒ تھا، حضرت آدم بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی ہر کتاب میں مولانا امین بدخشی رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر ملتا ہے۔ اور حضرت بنوریؒ جو حضرت آدم بنوریؒ کی ذُرّیّت اور سلسلے سے تھے، ان کو بھی ''بدخشاں'' سے آیا ہوا ایک عاشقِ صادق ملا اور ان کے ساتھ ذاتی وابستگی اختیار کی۔ ان ذاتی وابستگیوں کا نتیجہ تھا کہ حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی چہیتی دختر کا نکاح ان کے ساتھ ہوا۔

خاندانِ بنوریؒ، ایک تعارف

عزیزانِ گرامی! علماء کے خاندان کے تذکرے علمی ترقی کا باعث ہوتے ہیں۔ علامہ سیوطی رحمۃ اللہ علیہ کا انتقال کب ہوا؟ سیوطیؒ کی حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ سے ملاقات ہوئی یا نہیں ہوئی؟ سیوطیؒ کس عمر میں دراصل ان سے ملے تھے؟ یہ تمام باتیں جاننا کئی مسائل کی عقدہ کشائی کا باعث ہوتا ہے، اس لیے ضروری ہے کہ میں حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے خاندان کا کچھ تذکرہ کروں، حضرت بنوریؒ کی شادی پھوپھی زاد بہن سے ہوئی، خود دلہن کی طرف سے وکیل تھے، دلہن کی طرف سے خود نکاح پڑھایا، دو آدمی گواہ تھے، ان کے نکاح کا تذکرہ خود اتنا لذیذ اور دلفریب ہے کہ ان کے سوانح نگاروں نے تفصیل سے لکھا ہے، میں اس تفصیل میں نہیں جاتا۔

ان کو اللہ نے پہلی اولاد صاحبزادی کی صورت میں دی، ان صاحبزادی کی پیدائش اس وقت ہوئی جب آپ کا قیام ''ڈابھیل'' میں تھا، یہ صاحبزادی مولانا محمد طاسین صاحب کے عقدِ نکاح میں آئیں، جو اپنے طرز کے ایک البیلے محقق تھے، ان کی تصنیفات سے آج بھی کئی محققین استفادہ کر رہے ہیں۔ دوسری صاحبزادی،

جن کا نامِ نامی سیدۃ نساء العالمین حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے نام پر فاطمہ تھا۔ ان کے بعد اللہ نے حضرت کو ایک صاحبزادہ عطا کیا، جس کا نام الیاس تھا، ان کے اپنے دلچسپ اور بھرپور واقعات ہیں جو ہم نے اپنی پھوپھیوں سے سن رکھے ہیں۔ حضرت علامہ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے درمیان جو مکاتبت ہے، اس میں ان کی وفات کا تذکرہ آیا ہے، ان کا انتقال سال ڈیڑھ سال کی عمر میں ہو گیا تھا۔ بہرحال ان کے اپنے واقعات ہیں جو بیان کیے گئے ہیں۔ تیسرے نمبر کی صاحبزادی کا نکاح حضرت مولانا مفتی احمد الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ سے ہوا۔ اور پھر چوتھی صاحبزادی عطا ہوئیں، جن کا نکاح حضرت بنوریؒ کے بھانجے مولانا خالد بنوری صاحب کے ساتھ ہوا۔ ہماری سعادت ہے کہ اس موقع پر وہ تشریف لائے ہیں، دارالعلوم سرحد کے مہتمم ہیں، مولانا ایوب جان بنوری رحمۃ اللہ علیہ جو حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، ان کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت بنوریؒ نے اس چوتھی صاحبزادی کا خاص نام تفاؤلاً رکھا، یہ جو ''مشکاۃ المصابیح'' وغیرہ کتبِ حدیث میں باب الفأل والطیرۃ ہم پڑھتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم ناموں سے تفاؤل لیا کرتے تھے، تو ہمارے اکابر کی شخصیات میں یہ صفت رچی بسی ہوئی تھی۔ حضرت بنوریؒ نے چوتھی صاحبزادی کا نام تفاؤلاً بشارت کے مادہ سے لیا، اس نیک فالی پر کہ اللہ ان کے بعد مجھے بیٹے کی بشارت بھی دے گا، اور ادارہ کی بشارت بھی دے گا، اور دونوں کی بشارتیں اللہ تعالیٰ نے دیں۔

تذکرہ سیدہ فاطمہ بنوریہ رحمۃ اللہ علیہا

حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کی دوسری صاحبزادی جن کا نام فاطمہ تھا، نابینا ہو گئی تھیں، جامعہ سے پہلے پاکستان بننے کے بعد ٹنڈو الہ یار میں قائم کیے گئے دارالعلوم میں سب بڑے بڑے اکابر جمع ہو گئے تھے، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ، مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ، حضرت مولانا بنوریؒ، مولانا سلیم اللہ خان صاحبؒ، یہ شخصیات وہاں پڑھاتی تھیں۔ وہاں بیٹی کی آنکھ میں کوئی چیز چلی گئی، حضرت بنوریؒ کراچی میں مصروفیت کی وجہ سے ڈاکٹر کو دکھا نہ سکے، بعد میں آنکھ ضائع ہو گئی، حضرت بنوریؒ علاج کے لیے ڈاکٹر کے پاس تشریف لے کر گئے تو ڈاکٹر نے کہا: ''علاج تو ہو سکتا ہے، لیکن انہیں جنرل وارڈ میں رکھنا پڑے گا'' جس میں پردہ کا انتظام مشکل تھا، اس لیے باپ کی غیرت نے گوارا نہیں کیا، اور بیٹی نے بھی کہا: ''بابا! آنکھیں ضائع ہو جائیں، لیکن میں جنرل وارڈ میں عام مریضوں کے ساتھ نہیں ٹھہر سکتی۔'' علم قربانی مانگتا ہے! یہ ادارے اس طرح بنے ہیں! بانیِ جامعہ کی بیٹی کی آنکھیں بھی اس کے لیے قربان ہو گئیں! ان کے احوال حضرت بنوریؒ اور پھر مولانا محمد انور بدخشانی صاحبؒ نے اپنے ایک مضمون میں ذکر کیے ہیں، وہ بڑی نیک زاہدہ خاتون تھیں۔

یہ روایت اللہ کے ایک اور ولی جو اس وقت حیات ہیں، حضرت مولانا شمس الرحمٰن عباسی مدظلہم نے برسرِ منبر بیان کی ہے کہ حضرت کی صاحبزادی کو خواب میں اشارہ ہوا، جس کا اظہار انہوں نے اپنے والد ماجد سے

کیا کہ: ’’مجھے رسول اللہ ﷺ کی خواب میں زیارت ہوئی، اس ادارہ میں انور بدخشانی نام کا ایک آدمی ہے، بابا جان! میرا اس سے رشتہ طے کردیجیے۔‘‘ حضرت مولانا محمد انور بدخشانی صاحبِ جمال تھے، جوان تھے، حسن و جمال کا انتخاب کرسکتے تھے، مگر اپنے شیخ کے لیے قربانی دی اور ایک نابینا خاتون سے شادی کی۔ ایک اور صدری روایت بھی بیان کردینی چاہیے، مجھے حضرت بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کے صاحبزادے نے ان کی شادی کا دعوت نامہ دکھایا، جس میں ان کے نام کے ساتھ ’’سید‘‘ مرقوم ہے، یعنی وہ بھی سید خاندان کے تھے، مگر طبیعت میں اخفاء کا اور تواضع کا غلبہ ہوگا، اس لیے اس نسبت کا اظہار نہیں کرتے تھے، اور شیخ کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور ان کی نابینا بیٹی کے ساتھ رشتہ نبھایا۔ ایک کمرہ کے مکان میں ان دونوں میاں بیوی نے گزارا کیا۔ انہوں نے دو پارے اپنے شوہر سے پڑھے، ’’مقدمہ جزریہ‘‘ اپنے شوہر سے حفظ کیا۔ لہٰذا اے عزیزو! اس خانوادہ، اس گھرانے اور اس مدرسہ کے اطراف میں رہائش پذیر عفیف ماؤں کی قدر کرو، انہی شخصیات کی وجہ سے آج یہاں کے مرد اس ادارے کو سینچ رہے ہیں۔

ایک اور واقعہ ذکر کرکے بات ختم کردوں گا، ہماری ان پھوپھی (اہلیہ مولانا بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ) کا بعد میں علاج ہوا، اللہ نے اسباب مہیا کیے، ڈاکٹر مل گیا، اور ان کی بینائی واپس آگئی، ڈاکٹر نے کہا: ’’فی الحال یہ ایک شخص کو دیکھ سکتی ہیں، پھر آنکھوں پر پٹی لگادی جائے گی۔‘‘ آپ جانتے ہیں کہ میری ان پھوپھی نے کس شخصیت کا انتخاب کیا؟ اپنے باپ کا انتخاب نہیں کیا، بلکہ کہا: ’’میں اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی ہوں‘‘! سال ڈیڑھ سال میں کتنا حسنِ سلوک کیا ہوگا کہ اپنے باپ کو چھوڑ کر انہوں نے کہا: ’’میں اپنے شوہر کو دیکھنا چاہتی ہوں!‘‘ اپنے شوہر کو دیکھا، پھر گھر آگئیں، اور اس کے بعد بے احتیاطی ہوگئی اور آنکھیں دوبارہ چلی گئیں۔ میں ان کے حالاتِ زندگی پڑھ رہا تھا، مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ ان کا انتقال بھی عفت اور پاک دامنی کی وجہ سے ہوا، ولادت کے موقع پر گھر پر ہی رہنے کا فیصلہ کیا، اور اپنی زندگی عفت اور پاک دامنی کی نذر کردی۔

مولانا محمد انور بدخشانی رحمۃ اللہ علیہ کا حضرت بنوری رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت کا یہ سچا پکا تعلق تھا! چراغ سے چراغ جلتا ہے! آپ کو اپنے آپ کو جھکا کر کسی شخصیت کے ساتھ وابستہ ہونا پڑتا ہے، تب شخصیت کے اندر وہ روشنیاں اور چمک پیدا ہوتی ہیں، جو ان اکابر کے نام نامی سے پیدا ہورہی ہیں، آج کتنے علم کے حلقے ہیں جو خود کو مولانا بدخشانی کے ساتھ وابستہ پاتے ہیں۔ یہ تذکرہ ہے، جو اَب ساری زندگی چلتا رہے گا، ان کے احوال، ان کے واقعات، ان کی شخصیت، ان کا قرآنی ذوق، اب اللہ ہمارے نصیب میں یہی کردے کہ ہم ان اکابر کا تذکرہ کرتے رہیں، تو ہمارے سرمائے کے لیے بہت ہوگا۔

وآخر دعوانا أن الحمد للہ رب العالمین!

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

مدارس رجسٹریشن

اصل حقائق

مولانا قاری محمد حنیف جالندھری
ناظم وفاق المدارس العربیہ، پاکستان

میجر جنرل (ر) ڈاکٹر غلام قمر، ڈائریکٹر جنرل برائے مذہبی تعلیم و وفاقی وزارتِ تعلیم (اسلام آباد) کا ۳/ اگست ۲۰۲۴ء کو ایک قومی اخبار میں ''مدارس رجسٹریشن، حقیقت اور افسانہ'' کے عنوان سے کالم شائع ہوا ہے۔ اس کالم میں مدارس رجسٹریشن کے حوالے سے بعض باتیں ایسی ہیں جو حقائق کے منافی ہیں، ہم سمجھتے ہیں کہ ان باتوں کی وضاحت نہایت ضروری ہے۔ موصوف نے اپنے کالم میں مدارس رجسٹریشن، یکساں نصابِ تعلیم اور اتحادِ تنظیمات کے حکومتوں کے ساتھ مذاکرات کو موضوع بنایا ہے۔ ''انہوں نے تأثر دینے کی کوشش کی ہے کہ: ''۲۰۱۹ء میں وزارتِ تعلیم کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے مطابق دینی مدارس رجسٹریشن سے انکاری ہیں، اور وہ گورے انگریز کے بنائے ہوئے ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ کے تحت ہی مدارس کی رجسٹریشن کرانا چاہتے ہیں۔'' اس سلسلے میں چند گزارشات پیش ہیں:

❶ - حقیقت یہ ہے کہ ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ کے قانون کے متعلق یہ بات درست نہیں کی گئی، ہم تو درحقیقت اس ایکٹ کے سیکشن ۲۱/ کے تحت رجسٹریشن چاہتے ہیں، ۲۰۰۴ء میں سیکشن ۲۱/ اس وقت کے صدر اور آرمی چیف جنرل پرویز مشرف کے دور میں اتحادِ تنظیماتِ مدارس پاکستان اور حکومت کے مابین کئی مہینوں کے مذاکرات کے بعد حتمی اور طے ہوا تھا۔ وہ سیکشن ۲۱/ گورے انگریز کا نہیں، بلکہ مسلمانوں کا اور حکومتِ پاکستان کے اداروں کا طے کردہ ہے، اس لیے یہ تأثر دینا غلط ہے کہ ہم گورے انگریزوں کے ایکٹ کے تحت رجسٹریشن چاہتے ہیں۔ یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔ ۲۰۰۴ء میں طے ہونے والا سیکشن ۲۱/ خاص دینی مدارس کی رجسٹریشن کے لیے ہی ہے۔ ہم نے اس وقت یہ بات کہی تھی کہ اگر اس میں کسی بھی وقت ترمیم کی ضرورت ہو تو وہ بھی باہمی مشاورت سے کی جاسکتی ہے۔

یہاں جملہ معترضہ کے طور پر عرض ہے کہ ہم تو ۱۸۶۰ء کے سیکشن ۲۱/ کی بات کرتے ہیں جو ہم

مسلمانوں نے باہمی مشاورت سے طے کیا، جبکہ آپ نے تو ۱۸۶۰ء کے سوسائٹی ایکٹ کو اس کی روح کے مطابق اور اس کی تمام دفعات کو من وعن قبول کیا ہوا ہے۔ کیا اب بھی اس ایکٹ کے تحت مختلف ادارے اور سوسائٹیاں رجسٹرڈ نہیں ہوتیں؟! کیا آپ نے اس ایکٹ کو کبھی ختم کرنے کا سوچا بھی ہے؟ دوسری طرف ہمارا پورا عدالتی نظام برٹش لاء کے مطابق فیصلے کرتا ہے، جو گورے انگریز کا ہی وضع کردہ ہے، کیا کبھی اس سے پیچھا چھڑانے کا سوچا گیا؟ ایک پہلو اور بھی ہے کہ مدارس کی رجسٹریشن میں رکاوٹ کون ہے؟ کہیں یہ دباؤ کسی انگریز، گورے یا کالے کافروں کی طرف سے تو نہیں؟؟ اندر کی بات تو کوئی بھی نہیں بتا رہا۔

بہر حال یہ ۱۸۶۰ء کا سیکشن ۲۱ر متفقہ طور پر طے ہوا، اب یہ قانون بن چکا ہے۔ اس کے مطابق قومی اسمبلی اور چاروں صوبائی اسمبلیوں میں قانون سازی ہو چکی ہے۔ اور یہ جو وزارتِ تعلیم میں رجسٹریشن ہے، یہ تو ایگزیکٹو آرڈر کے تحت ہے، اس کی قانونی حیثیت نہیں ہے، اس لیے ہم جس قانون کی بات کر رہے ہیں وہ باقاعدہ ایک قانون ہے، اور جس کی آپ بات کر رہے ہیں وہ قانون ہے ہی نہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے کہا تھا کہ مدارس کے بند اکاؤنٹ کھلوائے جائیں اور نئے اکاؤنٹ کھلوانے میں بھی تعاون کیا جائے؛ یہاں تو اُلٹا مدارس کے اکاؤنٹ بند کیے جا رہے ہیں۔ تو معاملہ صاف شفاف کیسے رہا؟!

❷- موصوف نے اپنے کالم میں لکھا ہے کہ: ''معاہدے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ڈائریکٹریٹ جنرل برائے مذہبی تعلیم (ڈی جی آر ای) کا قیام عمل میں لایا گیا، مدارس کو چاہیے تھا کہ اپنی رجسٹریشن ڈی جی آر ای کے ساتھ کرواتے، لیکن اتحادِ تنظیماتِ مدارس نے اپنے زیر انتظام والحاق مدارس کی رجسٹریشن کروانے سے انکار کر دیا۔'' وغیرہ۔

اس سلسلے میں عرض ہے کہ مدارس رجسٹریشن کے سلسلے میں کوئی الگ ڈائریکٹریٹ قائم کرنے کی بات تو سرے سے معاہدے میں شامل ہی نہیں تھی، معاہدے کا منشا یہ تھا کہ دینی مدارس کی جو رجسٹریشن پہلے سوسائٹیز ایکٹ کے تحت وزارتِ صنعت کے ساتھ ہوتی تھی، اب وزارتِ تعلیم میں ہوگی، جس کا واضح مطلب یہ تھا کہ اسی سادگی کے ساتھ ہوگی جس سادگی کے ساتھ وزارتِ صنعت میں ہوتی تھی، اس کے لیے وزارتِ صنعت نے نہ کوئی الگ ڈائریکٹریٹ قائم کیا تھا، نہ ملک بھر میں اس کام کے لیے الگ دفاتر قائم کیے تھے، نہ پانچ سال کے بعد رجسٹریشن کی تجدید ضروری تھی، البتہ سالانہ کوائف بیشک بھیجے جاتے تھے۔ معاہدے میں ۱۲ر ریجنل سینٹر قائم کرنے کی بات تھی، اس کے متعلق یہی خیال تھا کہ جس طرح ہر ضلع میں وزارتِ تعلیم کا دفتر ہوتا ہے، انہی میں ۱۲ر منتخب اضلاع میں ریجنل دفاتر قائم کر دیے جائیں گے، جس کا عملہ وزارتِ تعلیم سے ہی منسلک ہوگا، جہاں مدارس کی رجسٹریشن بآسانی سہولت کے ساتھ ہو جایا کرے گی۔ اسی طرح جیسے دینی مدارس کی رجسٹریشن پہلے وزارتِ صنعت میں ہوتی تھی، اس کے لیے کوئی الگ عملہ نہیں تھا، کوئی الگ دفاتر نہیں تھے،

جیسے دیگر اداروں اور سوسائٹیوں کی رجسٹریشن ہوتی تھی، اسی طرح دینی مدارس کی بھی رجسٹریشن ہوجایا کرتی تھی، مگر یہ کہ ایک الگ ڈائریکٹریٹ قائم ہوگا، اس کا الگ عملہ ہوگا، باقاعدہ اربوں روپے کا فنڈ ہوگا، پھر اس ادارے کے پورے ملک میں ذیلی ادارے ہوں گے؛ یہ چیز معاہدے میں شامل نہیں تھی، بلکہ یہ تو سراسر دیوالیہ پن کے قریب پہنچنے والے قومی خزانے پر مزید بوجھ ڈالنے والی بات تھی۔ یہ سب یک طرفہ طور پر کیا گیا، جبکہ معاہدے میں یہ بات شامل تھی کہ ایسے کسی بھی اقدام سے قبل اتحادِ تنظیماتِ مدارس کو اعتماد میں لیا جائے گا۔ نیز ڈائریکٹریٹ کے تحت اتنے بڑے منصوبے کا لازمی نتیجہ یہ قرار دیا جائے گا کہ دینی مدارس اسی ڈائیریکٹریٹ کے ماتحت اور تابع سمجھے جائیں گے اور زبانی طور پر کہا گیا تھا کہ مدارس وزارتِ تعلیم سے منسلک ہوں گے، تابع نہیں ہوں گے، مذکورہ منصوبہ عملی طور پر اس کی نفی کرتا ہے۔ پھر یہ بھی کہ ڈی جی آر ای کا آفس اسلام آباد میں ہونے کی وجہ سے مدارس رجسٹریشن کے لیے آنے والے حضرات کی سفری مشکلات کا سبب بھی ہوتا۔ بہرحال یہ تمام باتیں معاہدے کے خلاف کی گئیں اور ان کا سوائے اس کے اور کوئی مقصد معلوم نہیں ہوتا کہ دینی مدارس کو پریشان اور کنٹرول کیا جائے۔ ملک میں جتنے بھی عصری تعلیمی ادارے ہیں، وہ اپنے اپنے ضلع میں متعلقہ محکمے میں رجسٹرڈ ہوتے ہیں، مدارس کے ساتھ ہی یہ امتیازی سلوک کیوں کہ وہ ضرور ایک الگ تھلگ ادارے سے (جس کی کوئی قانونی حیثیت بھی نہیں) منسلک ہوں؟

❸ - ہم بار بار یہ واضح کرچکے ہیں کہ دینی مدارس اپنی آزادی اور خودمختاری کو کسی رکاوٹ کے بغیر قائم رکھنے کے لیے پرعزم ہیں، اور کسی حکومتی ادارے کے تابع یا ماتحت ہونے کو گوارا نہیں کرسکتے اور اگر اس آزادی وخودمختاری کو باقی رکھنے کے لیے انہیں کوئی بھی قربانی دینی پڑے تو وہ اس کے لیے بھی تیار ہیں، لہٰذا وزارتِ تعلیم میں رجسٹریشن کے لیے اتنے بڑے منصوبے اور اتنے اخراجات کی نہ صرف یہ کہ ضرورت نہیں، بلکہ مقصد کے لیے بھی مضر ہے۔

❹ - جو ڈائیریکٹریٹ برائے مذہبی تعلیم قائم کیا گیا ہے، اُسے سرکاری تعلیمی اداروں میں دینی تعلیم بقدرِ ضرورت دینے کے لیے استعمال کیا جائے اور اس کے ذریعے تمام تعلیمی اداروں میں اتنی دینی تعلیم دینے کا اہتمام کیا جائے جو ہر مسلمان کے لیے فرضِ عین ہے۔

❺ - ۲۰۱۹ء میں وزارتِ تعلیم کے ساتھ جو معاہدہ ہوا تھا اس پر خود وزارتِ تعلیم نے عمل نہیں کیا، مثلاً معاہدہ میں یہ طے تھا کہ جب تک مدارس کی رجسٹریشن وزارتِ تعلیم کے ساتھ مکمل نہیں ہوجاتی، ان کی پرانی رجسٹریشن کو تسلیم کیا جائے گا، لیکن اس معاہدے کے بعد اس بات کو ایک دن کے لیے بھی تسلیم نہیں کیا گیا۔

معاہدے کی دوسری شق یہ تھی کہ جن مدارس کے اکاؤنٹس بند کیے گئے ہیں وزارتِ تعلیم نہ صرف وہ اکاؤنٹ کھلوائے گی، بلکہ نئے اکاؤنٹس کھلوانے میں بھی مدد کرے گی، وزارتِ تعلیم کی جانب سے اس

طرح کا کوئی تعاون نہیں ہوا۔ معاہدے کی ایک شق یہ تھی کہ مدارس کے کوائف اکٹھے کرنے کے لیے واحد مجاز ادارہ محکمہ تعلیم ہوگا، اس پر خود وزارتِ تعلیم نے ، حکومت نے ، معاہدے پر دستخط کرنے والوں، حکومتی عہدیداروں اور متعلقہ اداروں نے عمل نہیں کیا، جبکہ آج کے دن تک حسب سابق ایجنسیوں کے افراد کا مدارس میں آنے جانے ، مدارس کو خوفزدہ کرنے ، اور ہراساں کرنے کا سلسلہ جاری ہے۔

❻ - جہاں تک یکساں نصابِ تعلیم کی بات ہے تو اس کا ہم نے بالکل انکار نہیں کیا، ہم تو چاہتے ہیں کہ ملک میں طبقاتی نظامِ تعلیم کا خاتمہ ہو، یکساں نصابِ تعلیم کی تدوین میں تو ہم نے اپنا حصہ ڈالا ہے اور اس میں ہم نے عملی طور پر کام کیا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ کیا یکساں نصابِ تعلیم کو بیکن ہاؤس، لاہور گرامر اسکول، آکسفورڈ اور کیمبرج کے نام سے چلنے والے برینڈڈ عصری تعلیمی اداروں نے بھی تسلیم کیا ہے؟ یقیناً جواب نفی میں ہے۔ مدارس تو اب بھی کہتے ہیں کہ عصری مضامین کا جو بھی قومی نصابِ تعلیم ہوگا اسے اپنے ہاں ضرورت کے مطابق نافذ کریں گے۔ یہاں یہ بات بھی عرض کرتا چلوں کہ دینی مدارس اپنے ہاں عصری نصاب پڑھا بھی رہے ہیں، چناں چہ ابھی پچھلے دنوں میٹرک بورڈز کے جو امتحانی نتائج آئے ہیں اس میں ہمارے مدارس کے طلبہ نے اول دوم اور سوم پوزیشنیں لی ہیں، آپ ملتان بورڈ، بہاولپور بورڈ، ساہیوال بورڈ، راولپنڈی بورڈ، آزاد کشمیر بورڈ، اسی طرح فیڈرل بورڈ کے امتحانی نتائج کا جائزہ لے لیجئے، آپ کو مدارس کے طلبہ ٹاپ پہ نظر آئیں گے۔ اس سے یہ حقیقت آشکارا ہوتی ہے کہ مدارس اپنے ہاں نہ صرف عصری تعلیم دے رہے ہیں، بلکہ ان کا تعلیمی معیار بھی اتنا اعلیٰ ہے کہ طلبہ تعلیمی بورڈز میں ٹاپ پوزیشنیں لے رہے ہیں۔

ہم عصری تعلیم کے مخالف تھے نہ ہیں، لیکن آپ بتایئے کہ یکساں نصابِ تعلیم کے نفاذ میں رکاوٹ کون ہے؟ ان اداروں کے نام لیجیے، صورت حال تو یہ ہے کہ تمام صوبائی حکومتوں نے یکساں نصابِ تعلیم کے وژن کو قبول نہیں کیا۔ آپ کی ایلیٹ کلاس کے جو تعلیمی ادارے ہیں؟ اے لیول یا او لیول کراتے ہیں؛ وہ اسے قبول نہیں کررہے۔ اب بتایئے کہ دینی مدارس کا اس میں کیا قصور ہے؟!

❼ - دینی مدارس کی رجسٹریشن کے حوالے سے مزید عرض کرتا چلوں کہ موجودہ وزیر اعظم شہباز شریف صاحب جب پی ڈی ایم کے دورِ حکومت میں وزیر اعظم تھے، تو ان سے ہمارے کئی گھنٹے تک مذاکرات ہوئے، ان مذاکرات میں اس وقت کے وزیر تعلیم، وزیر داخلہ اور دیگر متعلقہ وزارتوں اور محکموں کے نمائندے موجود تھے، وزیر اعظم صاحب نے پوری بحث کے بعد ایک مسودے کی منظوری دی، اور حکم جاری کیا تھا کہ اس کے مطابق مدارس کو رجسٹریشن کا اختیار دے دیا جائے، اس میں دونوں آپشن موجود تھے، مدارس چاہیں تو اپنے آپ کو ۱۸۶۰ء کے سیکشن ۲۱ ر کے تحت رجسٹرڈ کرالیں، چاہیں تو وزارتِ تعلیم میں خود کو رجسٹرڈ کرالیں، اس سے پہلے بھی مدارس کو اختیار رہا کہ چاہیں تو سوسائٹی ایکٹ کے تحت رجسٹرڈ ہوں، چاہیں تو ٹرسٹ کے قانون کے تحت رجسٹرڈ ہوں۔ اب سوال یہ ہے کہ جب وزیر اعظم نے ہدایات جاری کر

دیں، اور معاہدے کے مسودے پر دستخط کردیے یعنی منظوری دے دی تو پھر اس پر عمل درآمد کیوں نہیں ہوا؟ وزیر اعظم ملک کا چیف ایگزیکٹو ہوتا ہے، کیا اس کے فیصلے کی کوئی اہمیت نہیں؟! اس پر بھی ذرا روشنی ڈالیے۔

پھر جب پی ڈی ایم کی حکومت کا آخری دور تھا، حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم العالی اور یہ عاجز بندہ ایک ہفتہ مسلسل اسلام آباد میں رہے، اس دوران ہماری ملاقاتیں ڈی جی سی محترم جناب آرمی چیف صاحب سے ہوئیں، وزیر اعظم شہباز شریف صاحب سے حضرت مولانا فضل الرحمٰن صاحب مسلسل رابطے میں رہے، ان مذاکرات اور رابطوں کے نتیجے میں ایک مسودے پر اتفاق بھی ہوگیا، جس میں وزارتِ تعلیم کے اور اسی شعبے کو جو مدارس کے لیے قائم کیا گیا تھا؛ ان کی تجاویز کو بھی لیا گیا، اور انہیں اس مسودے میں شامل کیا گیا، اسے خواندگی کے لیے قومی اسمبلی میں پیش کردیا گیا، تاکہ یہ باقاعدہ قانون بن جائے، پھر کیا وجہ ہوئی کہ اچانک اس پر عمل درآمد روک دیا گیا؟ اصل بات جو ہے وہ یہ کہ اس میں رکاوٹ کون بنا؟ یقیناً اس میں کچھ عالمی اداروں کی مداخلت بھی ہے، جسے چھپایا جارہا ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ ہم متعلقہ فریق ہیں، ہمارے تحفظات کو سامنے رکھ کر بات کی جائے۔ اور اگر کسی عالمی ادارے کی طرف سے مسئلہ ہے تو ہم اس کے ساتھ بیٹھ کر بات کرنے کے لیے بھی تیار ہیں۔ بہرحال قرائن اور علامات بتاتی ہیں کہ درونِ خانہ کوئی بات ضرور ہے، اور یہ رکاوٹیں عالمی دباؤ پر ہیں، ہمارے متعلقہ محکمانہ افراد گوروں اور انگریزوں کے دباؤ میں ہیں، اسی لیے جب بھی طویل مذاکرات کے بعد کسی مسودے پر اتفاقِ رائے ہوتا ہے تو حکومت اچانک پیچھے ہٹ جاتی ہے۔

آخر میں یہ کہنا چاہوں گا کہ مدارس کی دینی خدمات پر انہیں سراہنے اور اور ان کی خدمات کے اعتراف میں تنگ دلی کا مظاہرہ کیا جاتا ہے۔ ابھی میٹرک کے امتحانات میں مدارس کے طلبہ نے ٹاپ پوزیشنیں لی ہیں، مگر کیا کسی بھی اعلیٰ حکومتی شخصیت یا سرکاری ادارے کی جانب سے اس بات کو سراہا گیا ہے؟ اس کی بجائے اُلٹا مدارس کو کبھی رجسٹریشن کے نام پر، کبھی کوائف طلبی کے نام پر، کبھی کسی اور بہانے سے تنگ اور پریشان کرنے کا عمل تسلسل سے جاری رہتا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ دینی مدارس کی آزادی وخودمختاری، خودداری، اور حریتِ فکر وعمل سب سے اہم ہے، ہم اسے دینی علوم کے تحفظ، اُمتِ مسلمہ کی صحیح دینی رہنمائی، اور علومِ اسلامیہ کی اشاعت کے لیے ضروری سمجھتے ہیں۔ ان شاء اللہ اس سلسلہ میں ہم اپنا فرض ادا کرتے رہیں گے۔

الحمدللہ تمام مکاتبِ فکر کے دینی مدارس وجامعات کی اکثریت اتحاد تنظیماتِ مدارس پاکستان میں شامل وفاق وتنظیموں سے وابستہ ہے اور اتحاد تنظیماتِ مدارس پاکستان کی مرکزی قیادت محبِ وطن اور علم وفضل میں مشہور ومعتبر شخصیات پر مشتمل ہے اور یہی پاکستان کے تمام دینی مدارس وجامعات کے نمائندہ ہیں۔

..... ❀ ..... ❀ ..... ❀ .....

علومِ حدیث کی تطبیق میں اِفراط وتفریط کے مظاہر

(دوسری اور آخری قسط) افادات: مولانا محمد عبدالمالک (ڈھاکہ، بنگلہ دیش)
تلخیص وترتیب جدید: مولانا محمد یاسر عبداللہ (اُستاذِ جامعہ)

علومِ حدیث کی تطبیق میں افراط کا نتیجہ

علومِ حدیث کے استعمال میں اِفراط کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض لوگ اجماعیات اور مسلّمات کا بھی انکار کر بیٹھتے ہیں، مثلاً:

❶- بعض لوگ عقیدہ نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کا انکار کرتے ہیں، جیسے: مصر کے شیخ ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ کسی دور میں نزولِ عیسیٰ علیہ السلام کے قائل نہیں تھے، چوں کہ محتاط آدمی تھے، اس لیے غالباً اس موضوع کے متعلق کوئی کتاب نہیں لکھی، بس ان کے ذہن میں ایک بات آگئی، شاید ان کی نظر میں چند ایسی روایات ہوں جن پر کلام ہو، اور مکمل تحقیق کا موقع نہ مل سکا، اس لیے ذہن میں یہی نظریہ بن گیا۔ جب شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق سے ''التصريح بما تواتر في نزول المسيح عليه السلام'' شائع ہوئی تو شیخ عبدالفتاح رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا ایک نسخہ، شیخ ابوزہرہ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ہدیہ بھیجا، شیخ نے کتاب کے مطالعہ کے بعد شیخ عبدالفتاح کا شکریہ ادا کیا اور کہا کہ:

''اب میری رائے بدل گئی ہے، میرے علم میں نہیں تھا کہ اس بارے میں اس قدر صحیح احادیث موجود ہیں۔''

❷- شیخ محمود شلتوت نے عقیدہ نزولِ مسیح علیہ السلام کے انکار میں ایک کتاب لکھی، جس کے رد میں شیخ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے ''نَظْرَةٌ عَابِرَةٌ فِيْ مَزَاعِمِ مَنْ يُّنْكِرُ نُزُوْلَ عِيْسٰى قَبْلَ الْآخِرَةِ'' لکھی۔

❸- امام مہدی رضی اللہ عنہ کے بارے میں جو روایات ہیں، ان میں سے بعض میں کچھ کلام ہے، ابن خلدون رحمۃ اللہ علیہ نے ان روایات پر کلام دیکھا تو سارا کلام نقل کردیا، اور اُسلوب ایسا اختیار کیا کہ گویا وہ خود بھی خروجِ مہدی کے منکر ہیں۔ (ملاحظہ کیجیے: مقدمة ابن خلدون، الفصل الثاني والخمسون، ص: ۳۱۱، ۳۱۲)

یہاں یہی وہم ہوا کہ جرحِ رواۃ کا غلط اور بے موقع استعمال کیا، ابن خلدون کے اس وہم کے رد میں بھی مستقل رسائل لکھے گئے ہیں: ایک کتاب ''إبراز الوهم المكنون من كلام ابن خلدون'' ہے، یہ شیخ احمد بن صدیق الغماری رحمۃ اللہ علیہ کا رسالہ ہے، میں نے اس کا مطالعہ نہیں کیا۔ دوسرا رسالہ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ہے، جو امداد الفتاویٰ (ج:۶،ص: ۲۴۷-۲۵۵) میں چھپا ہوا ہے، نہایت قابلِ مطالعہ ہے۔

یہ سب علومِ حدیث کی تطبیق میں افراط کے نتائج ہیں کہ مسلّمات اور اجماعیات کا بھی لوگ انکار کر بیٹھتے ہیں۔

الغرض علوم حدیث کا افراط پر مبنی استعمال تو یہ ہوا کہ جرحِ معلول، اعلالِ مجروح، علتِ غیر قادحہ، بلکہ جرحِ مختلف فیہ یا علتِ مختلف فیہا کو بہانہ بنا کر کسی ایسی حدیث کو رد کر دیا جائے جو امت میں مُتَلَقّٰی بالقبول ہے، یا محض اسنادی ضعف کی وجہ سے کسی حدیث کو متروک اور اس میں مذکور حکم کو باطل قرار دے دیا جائے، جبکہ وہ حکم مُتَلَقّٰی بالقبول ہے، اور اس کے دیگر دلائل موجود ہیں۔

نیز یہ تحکّم بھی سراسر غلو ہے کہ کسی امام کی مجتہد فیہ تصحیح وتضعیف کو متفق علیہ اور قطعی تصحیح وتضعیف کی طرح کسی دوسرے امام پر مسلط کیا جائے، اور اس سے اختلاف کرنے کی وجہ سے ان کو یا ان کے متبعین کو مطعون کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ ہر قسم کے غلو اور تطرف سے ہمیں بچنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین!

تنبیہ: علومِ حدیث سے مراد

اس موقع پر یہ نکتہ واضح رہے کہ ''علوم الحدیث'' سے ہماری مراد لغوی معنی کے اعتبار سے علومِ حدیث نہیں، وہ تو بحرِ ناپیدا کنار ہے، اس میں تو فقه الحديث اور علم نقل الحديث متناً و إسناداً وغیرہ بھی داخل ہیں۔ ظاہر ہے ان علوم کا موضوع لہ، نقدِ خبر الآحاد نہیں ہے، بلکہ ہماری مراد وہ علوم ہیں جن کو عرف میں ''علوم الحدیث'' کہا جاتا ہے، ''علوم الحديث بالمعنى العام'' میں بہت سے علوم وفنون ایسے ہیں جن کو عرف میں ''مصطلح الحديث'' اور ''أصول الحديث'' بھی کہا جاتا ہے، ''علوم الحديث'' سے یہاں یہی علوم وفنون مراد ہیں۔

مسلَّمات واجماعیات میں علومِ حدیث کی عدمِ تطبیق سے کیا مراد ہے؟

یاد رکھیے! ہم نے جو یہ کہا ہے کہ جو امور، اہلِ علم یا جمہور اہلِ علم کے اِجماع سے ثابت ہیں، یا جن کی حیثیت مسلّمات کی ہے، ان میں خبرِ واحد کے اصولوں کو نافذ کرنے کی کوشش کرنا غلط ہے، اس سے ہماری

مراد یہ ہے کہ ان مسائل کی اصطلاحی صحیح سند نہ ملنے کی وجہ سے ان کا انکار کرنا غلط ہے، یہ مطلب ہرگز نہیں کہ اگر اُن مسائل کے متعلق کوئی ضعیف روایت آئی ہو تو فنی نقطہ نظر سے اس کا ضعف بیان کرنا بھی درست نہیں ہے، محض فنی لحاظ سے اس کا ضعف بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن اس ضعف کو بنیاد بنا کر ان مسلَّمات کو باطل قرار دینا، علومِ حدیث کے استعمال میں حد سے تجاوز اور اِفراط ہے، جو غلط ہے، صرف فنی لحاظ سے کسی روایت کو ضعیف کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ صرف نفس معنی صحیح ہونے کی وجہ سے منکر یا واہی روایت کو صحیح کہنا یا سمجھنا بجائے خود علومِ حدیث کا غلط استعمال ہے، جس کا بیان ہم نے مظاہرِ تفریط میں کیا ہے۔ اس کی مزید وضاحت ملاحظہ فرمائیں:

ثابت شدہ حدیث کے موضوع طرق بھی ہو سکتے ہیں

بدیہی سے بدیہی موضوع پر بھی کبھی منکر روایت آ جاتی ہے، جیسے: جھوٹ بولنا، قطعی طور پر ناجائز اور حرام ہے، اور آنحضرت ﷺ پر جھوٹ بولنا زیادہ بڑا گناہ ہے، اس بارے میں حدیث ''من كذب عليّ متعمّدًا فليتبوأ مقعدهٗ من النار'' کو اہلِ علم نے متواتر قرار دیا ہے، اور بلاشبہ یہ روایت خود ''متواترِ اِسنادی'' ہے، اور اس کا مضمون اور معنی تو بہر حال ''متواتر بتواترِ طبقہ'' ہے؛ لیکن اس حدیث کے مقدارِ تواتر سے زائد کچھ طرق بھی ہیں، جن میں سے بعض طرق، ضعیف اور بعض منکر ہیں، اب اگر کوئی ان خاص طرق کی نکارت کو بیان کرے تو کیا اس کو یہ کہہ کر ملامت کیا جا سکتا ہے کہ یہ تو ''متواتر'' حدیث ہے، تم اسے ''منکر'' کیوں کہہ رہے ہو؟ ظاہر ہے کہ ملامت نہیں کیا جا سکتا؛ کیونکہ وہ اس حدیث کو یا معاذ اللہ اس کے مفہوم کو ''منکر'' نہیں کہہ رہا، بلکہ فنی ذمہ داری ادا کرنے کے لیے اس کی بہت سی سندوں میں سے ایک خاص سند کو ضعیف یا منکر کہہ رہا ہے۔ کسی مضمون کے صحیح اور متواتر طرق سے ثابت ہونے کا یہ مطلب تو نہیں کہ اس کو کوئی کذاب یا وضاع بیان نہیں کرے گا۔ اگر کوئی صحیح روایت، منکر طریق سے آئے، یا صحیح اور متواتر حدیث کے کسی خاص طریق میں کوئی منکر اضافہ ہو تو ایسے طریق اور اضافے کو منکر کہنے میں کیا مانع ہے؟ اور اسے منکر نہ کہنے کا کیا جواز ہے؟

''فتح الباري'' میں حافظ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے حدیث ''من كذب علي متعمّدا. . . إلخ'' کے طرق کے بارے میں مجموعی طور پر کلام کیا ہے کہ اس کے کتنے طرق صحیح ہیں؟ کتنے حسن، کتنے ضعیفِ متماسک (یعنی جن کا ضعف شدید نہیں ہے) اور کتنے واہی اور منکر ہیں؟ نیز لکھا ہے کہ (۳۳) صحابہؓ سے یہ روایت، صحیح اور حسن طرق سے ثابت ہے، اور (۵۰) صحابہؓ سے ضعیف اسانید کے ساتھ، جبکہ (۲۰) صحابہؓ سے واہی اسانید سے مروی ہے۔ (فتح الباري: ۱/۲٤٥، ح: ۱۱۰) ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''الموضوعات'' کے

شروع میں اس حدیث کے ہر طرح کے طرق ذکر کردیے ہیں۔

حدیث ’’من کذب. . . إلخ‘‘ کے شانِ ورود سے متعلق روایات کا درجہ

اس حدیث کے شانِ ورود کے بارے میں ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جو واقعات نقل کیے ہیں، وہ نہ صرف سند کے لحاظ سے ضعیف ہیں، بلکہ متن کے اعتبار سے بھی منکر ہیں، اور ان کے مندرجات سے منکرینِ حدیث اور مستشرقین بھی اپنے مقاصد کے لیے استدلال کر سکتے ہیں؛ کیونکہ حفاظتِ حدیث کی تاریخ میں ایک بحث آتی ہے کہ آپ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نام پر جھوٹ بولنے کا آغاز کب سے ہوا؟ اور کذب علی الرسول کی تاریخ کیا ہے؟ مستشرقین کی کوشش ہوتی ہے کہ اس تاریخ کو قدیم سے قدیم تر ثابت کیا جائے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے اس نوعیت کا جھوٹ شروع ہو گیا تھا، اور دلیل میں اسی حدیث ’’من كذب عليّ متعمّدا. . . إلخ‘‘ کا حوالہ دیتے ہیں کہ اگر جھوٹ کا کوئی واقعہ نہیں ہوا تو یہ بات کیوں کہی گئی؟! یہ بالکل جاہلانہ اور معاندانہ بات ہے، اس زمانے میں کون جھوٹ بولتا تھا؟ ’’خير الناس قرني، ثم الذين يلونهم، ثم الذين يلونهم، ثم يفشو الكذب‘‘، الحديث. (صحیح البخاری:۲۶۵۲)

قرآن کریم میں ارشاد ہے:

’’لَئِنۡ اَشۡرَكۡتَ لَيَحۡبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ‘‘ (الزمر:۶۵)

’’اے عام مخاطب! اگر تو شرک کرے گا تو تیرا کیا کرایا کام غارت ہو جائے گا اور تو خسارہ میں پڑے گا۔‘‘

’’وَلَوۡ تَقَوَّلَ عَلَيۡنَا بَعۡضَ الۡاَقَاوِيۡلِ لَاَخَذۡنَا مِنۡهُ بِالۡيَمِيۡنِ ثُمَّ لَقَطَعۡنَا مِنۡهُ الۡوَتِيۡنَ‘‘

(الحاقۃ:۴۴،۴۶)

’’اور اگر یہ ہمارے ذمہ کچھ باتیں لگا دیتے تو ہم اُن کا داہنا ہاتھ پکڑتے، پھر ان کی رگ کاٹ دیتے۔‘‘

یہ آیات کیوں نازل ہوئیں؟ کیا ایسا کوئی واقعہ ہوا تھا؟ یا ایسا ہونے کا کوئی شائبہ یا امکان بھی تھا؟!

یہ تو ان معاندین کی ایک عقلی اُپج تھی، البتہ ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ نے جو واقعہ بیان کیا ہے، وہ بالکل منکر ہے، جھوٹ کی قباحت کو بیان کرنے کے لیے جھوٹی روایت لے آئے۔ علامہ ابن تیمیہ رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ’’الصارم المسلول‘‘ میں اس واقعہ کو اس طرح نقل کیا ہے کہ گویا اس کو صحیح سمجھ رہے ہیں، جس پر حافظ ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے نکیر کرتے ہوئے ’’سير أعلام النبلاء‘‘ میں لکھا ہے: ’’تمّ عليه الوهم في ذلك‘‘ (۳۷۴/۷) (یعنی ابن تیمیہؒ کو اس واقعہ کے نقل کرنے میں وہم ہوا ہے) اور ’’ميزان الاعتدال‘‘ (ج:۲ ص:۲۹۳) میں لکھا ہے: ’’ورواه كله صاحب الصارم المسلول، وصحّحه، ولم يصحّ بوجه.‘‘ (صاحبِ ’’الصارم

المسلول'' نے اس روایت کو مکمل نقل کیا اور اسے صحیح قرار دیا ہے، حالانکہ یہ روایت کسی طور صحیح نہیں ہے)۔

حافظ رحمۃ اللہ علیہ کو بھی ''التلخیص الحبیر'' میں اس مقام پر کچھ خلط ہوا ہے کہ منکر حصہ پر مشتمل روایت کو ایسے شاہد کی بنیاد پر حسن کہہ دیا ہے، جس میں وہ منکر حصہ سرے سے نہیں ہے۔ بہرحال یہ روایت (یعنی عہدِ رسالت میں کذب علی النبي صلی اللہ علیه وسلم کا شروع ہونا) بالکل منکر ہے، اور سند کے لحاظ سے بھی ثابت نہیں۔ ''لمحات من تاریخ السنة وعلوم الحدیث'' للشیخ عبدالفتاح أبوغدة رحمه اللہ (ص:۵۶-۶۵) میں اس کی تفصیل دیکھی جاسکتی ہے۔

مستشرقین وغیرہ کا مقصد یہ ہے کہ دورِ رسالت میں جھوٹ کا وجود ثابت کریں، تاکہ یہ کہہ سکیں کہ سب سے زیادہ حدیثیں کون بیان کرتا تھا؟ اس طرح سیدنا حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جیسے حافظ الصحابہؓ، اور امامِ صدق و اتقان کو مطعون کرنا چاہتے ہیں۔ رضي اللہ تعالیٰ عن الصحابة وأرضاهم، وأبعد الطاعنین فیهم وأخزاهم.

موضوع روایات کے متعلق وضع

ہماری زیرِ تصنیف کتاب ''إنعام النظر'' میں ایک عنوان ہے: ''الوضع في الموضوعات'' یعنی ''موضوعات کے بارے میں وضع، اور کذابین کے بارے میں جھوٹ۔'' اس کی بہت سی صورتیں ہیں، مثلاً: یوں کہہ دیا کہ فلاں نے اتنے لاکھ احادیث وضع کیں! سوال یہ ہے کہ کیا اس میں اتنی صلاحیت اور عقل تھی کہ اتنی روایات وضع کرسکتا؟

مختلف کذّابین کے بارے میں جو واقعات بیان کیے جاتے ہیں، ان میں موضوعات اور من گھڑت باتیں بھی ہیں، جیسے: ''رتن ہندی'' کے بارے میں بہت سی احادیث وضع کی گئی ہیں، جو خود اس نے بیان نہیں کیں۔ ایک کتاب ہے: ''الرتنیات''، یعنی وہ روایات جو رتن ہندی نے روایت کی ہیں، اب وہ تو ہندی شخص تھا، اس میں اتنا سلیقہ کہاں تھا کہ عربی میں اتنی روایتیں گھڑ لیتا؟ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے ''میزان الاعتدال'' میں لکھا ہے: ''ومع کونهٖ دجالا کذّابا فقد کذبوا علیه جملة کبیرة من أسمج الکذب والمحال'' (۲/۴۵) (رتن ہندی کے خود کذاب و دجال ہونے کے باوجود بعض لوگوں نے اس پر ایسی روایات گڑھ لی ہیں، جو انتہا درجہ جھوٹی اور محال ہیں)۔ اسے کہتے ہیں: ''الوضع في الموضوعات''، (یعنی موضوعات کے متعلق من گھڑت روایتیں!)، یہ بھی جائز نہیں؛ کیونکہ کذّاب پر بھی جھوٹ بولنا جائز نہیں ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص کسی کذّاب کے واسطے سے ہی حدیث وضع کرے تو یہ

دروغ اور غَرر کا مجموعہ ہوگا۔

فنِ روایت سے ناآشنائی کا نقصان

حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا عبدالصمد صارم رحمۃ اللہ علیہ نے ''رتن ہندی'' کو صحابیؓ لکھ دیا ہے۔ صارم صاحب کا مطالعہ فی الجملہ اچھا تھا، اس لیے بہت سی کتابیں بھی لکھیں؛ لیکن علمِ روایت سے انہیں خاص مناسبت حاصل نہیں تھی، اور اِتقان بھی کم تھا۔ مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ بڑے آدمی تھے، عقل اونچی تھی، فکر بلند تھی، سلیقہ تھا، مطالعہ فی الجملہ وسیع تھا، انہیں بہت سے کمالات حاصل تھے، اس لیے ان کے قلم سے بہت اچھی اچھی کتابیں سامنے آئیں: ''ہندوستان میں نظامِ تعلیم و تربیت''، ''تدوینِ حدیث'' اور ''تدوینِ قرآن'' بعض پہلوؤں سے اچھی کتابیں ہیں۔ ''النبي الخاتم'' مختصر ہونے کے باوجود ایک شاہکار ہے، لیکن انہیں علمِ روایت سے خاص مناسبت حاصل نہیں تھی، جہاں خالص نقل چاہیے، وہاں عقل بہر حال کام نہیں آسکتی۔ ''علم النقد والنقل'' کو سمجھنے کے لیے روایت کی اصطلاحات و زبان سے واقفیت ضروری ہے۔ اگر یہاں بھی عقل استعمال کرنے کی کوشش کی گئی تو وہی حالت ہوگی جو بہت پہلے علامہ کرمانی رحمۃ اللہ علیہ (شارحِ بخاری) کی ہوئی، چنانچہ ''باب بدء الوحي'' کے آخر میں امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول ''رواہ صالح بن کیسان و یونس و معمر عن الزهري'' کی شرح میں علامہ کرمانیؒ نے مختلف احتمالات بیان کیے اور لکھا ہے: ''وإن كان الظاهر اتحاد الإسناد'' (۱/۶۸) حافظ رحمۃ اللہ علیہ کو کہنا پڑا:

> ''هٰذا الظاهر كاف لمن شمّ أدنى رائحة من علم الإسناد، و الاحتمالات العقلية المجرّدة لامدخل لها في هذا الفن.''
>
> ''علمِ اسناد'' سے ادنیٰ مناسبت کے حامل کے لیے یہ ظاہر کافی ہے، درحقیقت محض عقلی احتمالات کا اس فن میں کوئی کردار نہیں۔''

اسی طرح علامہ طیبی رحمۃ اللہ علیہ بہت بڑے آدمی ہیں، لیکن منقولات میں ان سے بھی تسامح ہوتا رہتا ہے، یہ صرف حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کی بات نہیں، بہت سے لوگوں سے ایسی لغزشیں ہوئی ہیں۔

بہر حال اصولی طور پر روایت کے فن میں احتمالاتِ عقلیہ مجردہ کو دخل نہیں دینا چاہیے، جہاں خالص نقل کی ضرورت ہو، وہاں نقل کے اسرار و رموز سے آشنائی ضروری ہے، صرف عقل کی دوڑ کام نہیں آئے گی۔ اس میں شک نہیں کہ نقل کے لیے بھی عقل چاہیے اور عقل کے بغیر نقل کا حق ادا نہیں ہوسکتا۔ کہا جاتا ہے: ''یک من علم را دہ من عقل باید'' (ایک من علم کے لیے دس من عقل درکار ہوتی ہے)، اسی لیے ہم فنی اعتبار سے تفقّہ پر زور دیتے ہیں،

لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ خاص نقل کے مقام پر محض عقل استعمال کرنا بجائے خود غلط ہے، روزمرہ کی مثال دیکھ لیں، مثلاً: کوئی شخص پوچھے: کمرے میں فلاں شخص موجود ہے یا نہیں؟ اب صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ کمرے میں دیکھا جائے اور اس کے بعد بات کی جائے۔ اگر کوئی شخص وہیں بیٹھے بیٹھے محض احتمالات بیان کرنا شروع کر دے کہ اس وقت چوں کہ فلاں شخص یہاں کام کرتا ہے، اس لیے اس کا ہونا ممکن ہے۔ ظاہر سی بات ہے کہ ان عقلی احتمالات سے کوئی فائدہ نہیں ہوسکتا۔

بہرکیف ''رتن ہندی'' کا معاملہ خالص نقل سے تعلق رکھتا ہے؛ لیکن مولانا گیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے اسے عقلی طور پر حل کرنے کی کوشش کی ہے، کسی ماہنامہ میں ان کا یہ مضمون چھپا، اس کے بعد علیحدہ رسالے کی صورت میں ''ایک ہندوستانی صحابی'' کے نام سے شائع ہوا ہے! ''الإصابة'' وغیرہ میں ''رتن ہندی'' کی صحابیت کے خلاف واضح دلائل موجود ہیں، لیکن مولانا کو تنبُّہ نہیں ہوا، اس کا سبب صرف فنی اصطلاحات اور تعبیرات کے ساتھ قلتِ اُنس ہے اور کچھ نہیں، بس اسی وجہ سے ''رتن'' کا صحابی نہ ہونا جو ایک متفق علیہ مسئلہ تھا، وہ ان کی نظر میں مختلف فیہ ہوگیا!

آمدم برسرِ مطلب

خیر یہ حدیث ''من كذب علي متعمّدا. . . إلخ'' متواتر ہے؛ لیکن اس کے منکر طرق کے بارے میں اگر کوئی کہے کہ جھوٹ بولنا تو بدیہی طور پر حرام ہے، اور اس روایت میں بھی یہی آیا ہے، نیز مسلّمات اور ضروریات میں سند دیکھنے کی ضرورت نہیں ہوا کرتی، لہٰذا یہ روایت صحیح ہے! بتائیے کیا ایسا کہنا درست ہوگا؟ ظاہر ہے کہ یہ کہنا غلط ہے اور علومِ حدیث کی غلط تطبیق ہے۔ یہ روایت بجائے خود فنی اعتبار سے منکر ہے، لہٰذا اسے منکر ہی کہا جائے گا، اور قدرِ مشترک سے زائد جتنی باتیں صرف ان منکر طرق میں موجود ہیں، وہ منکر اور متروک ہی ہوں گی۔

مظاہرِ افراط میں سے صرف دو مظاہر مزید ذکر کرتے ہیں، ویسے بھی اس موقع پر کسی بھی موضوع میں استقصاء مقصد نہیں ہے، بلکہ بعض ضروری باتیں ذکر کرنا مقصود ہے۔

②-مقلّد ہونے کے باوجود علومِ حدیث کی محققانہ تطبیق

علومِ حدیث کی میراث سے استفادے کے تین طریقے ہیں:

❶-محقّقانہ ❷-مقلّدانہ ❸-جاہلانہ۔

بعض عقل پرست لوگ، جنہیں ''علوم الإسناد'' کی شُدبُد ہی نہیں، علومِ حدیث کے قواعد سے

استفادے کی جرأت کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کا استفادہ ''جاہلانہ'' ہی ہوگا اور تحریف اور اِفساد کے علاوہ کچھ نہیں ہوگا! ایسے لوگوں کے لیے جائز ہی نہیں کہ علومِ حدیث سے براہِ راست استفادہ کریں، بلکہ انہیں تو اہلِ علم کی تقلید کرنی چاہیے۔ اسی طرح جو ''مقلّدانہ'' استعمال جانتا ہو، اس کے لیے اپنی حدود سے بڑھ کر ''محققانہ'' استعمال غلط ہوگا۔

مقلّدانہ طور پر علومِ حدیث سے استفادے کا سلیقہ سیکھنے کے لیے بھی بہت محنت کی ضرورت ہے، ہمارے ہاں طلبہ دو تین سال ''تدريب في علوم الحديث'' میں لگاتے ہیں، ان تین سالوں میں بہت سے طلبہ کو علومِ حدیث سے مقلّدانہ استفادے کا صحیح سلیقہ بھی نہیں آتا؛ کیونکہ ذی استعداد، باصلاحیت اور نبیہ طالب علم کو بھی مقلّدانہ استفادے کا ملکہ حاصل کرنے کے لیے کم از کم چار پانچ سالوں کی ضرورت ہے۔ اب اگر کسی نے مقلّدانہ استفادے کا طریقہ بھی نہ سیکھا ہو اور فن میں دخل اندازی اس طور پر کرنے لگے کہ گویا وہ محقّقِ فن ہے، تو نتیجے میں خسارہ ہی خسارہ ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی نے مقلّدانہ استعمال تو سیکھ لیا، لیکن ان علوم کا استعمال محقّقانہ کر رہا ہو، تو یہ بھی علومِ حدیث کا غلط اور اِفراط پر مبنی استعمال ہے، جو ناجائز ہے۔

کسی کے ذہن میں یہ سوال آسکتا ہے کہ یہ طرزِ عمل کیوں ناجائز ہے؟ تو اس کی وجہ یہ ہے کہ علومِ حدیث کے بہت سے قواعد، حساب کے قواعد کی طرح بالکل دوٹوک نہیں ہیں کہ دو اور دو چار کی طرح ہوں، کیا دو اور دو چار کی طرح حدیثِ حسن، شاذ اور منکر کی کوئی تعریف ہے؟ کس راوی کو ''منكر الحديث'' کہنا ہے؟ کیا اس کا کوئی متعین اور واضح معیار ہے کہ ہر ایک اس کو سمجھ لے؟ نیز بہت سے امور کا معیار تو موجود ہے، لیکن اتنا دو ٹوک اور واضح نہیں ہے کہ غیر اہلِ فن بھی اس کی تمیز کر سکیں، ناسمجھ آدمی، اہلِ فن سے لڑتا رہے گا کہ کہیں کچھ کہہ دیتے ہیں اور کہیں کچھ، جبکہ اہلِ فن سے لڑنا بے ذوقی کی دلیل ہے۔

اہلِ فن کا مرتبہ و مقام

اہلِ فن، ''اشباہ و نظائر'' اور ''فروق'' سے آگاہ ہوتے ہیں، اور بہت سے امور بظاہر ایک جیسے نظر آتے ہیں؛ لیکن حقیقت میں ان میں دقیق فرق ہوتا ہے، جسے اہلِ فن سمجھتے ہیں۔

اہلِ فن ایک ہی ثقہ راوی کی ''زیادت'' کہیں قبول کر لیتے ہیں اور کہیں اسی کی ''زیادت'' کو شاذ کہہ دیتے ہیں۔ یہ معمّہ اہلِ فن آپس میں حل کر سکتے ہیں، غیر اہلِ فن اسے حل نہیں کر سکتے؛ کیونکہ اہلِ فن کو ''فروق'' معلوم ہوتے ہیں اور غیر اہلِ فن کی نظر ان امور سے قاصر ہوتی ہے، اس بنا پر غیر اہلِ فن کے لیے اہلِ فن کی تقلید کے علاوہ سلامتی کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ اور ہر فن میں وہی ماہر ہوتا ہے جو اس فن کے مشتبہات میں وجوہِ فرق کا

اِدراک کرسکے، غیر اہلِ فن کہاں ان دقائق تک رسائی حاصل کرسکتا ہے؟! مثلاً: ایک ہی معیار کے دو ثقہ راویوں میں سے ایک کی زیادت' حسن قرار پاتی ہے اور دوسرے کی ضعیف۔ غیر اہلِ فن کو یہ فرق سمجھانا محال ہے، اہلِ فن ہی ایک دوسرے کو سمجھا سکتے ہیں۔

اگر فن سے ناواقف لوگ' فن کا محقّقانہ استعمال وتطبیق کریں گے تو منکر کو معروف اور معروف کو منکر بنائیں گے، شاذ کو محفوظ اور محفوظ کو شاذ بنائیں گے۔ یہ اس غلط استعمال کا کم تر خسارہ ہے، اس لیے جس میں صرف مقلّدانہ استعمال کی صلاحیت ہو تو اسے محققانہ استعمال کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، ایسی کوشش حد سے تجاوز اور علومِ حدیث کا غلط استعمال ہوگا۔

③ - علومِ حدیث کی تطبیق کے لیے ادب اور فنی بصیرت کے حصول میں کوتاہی

علومِ حدیث کے استعمال وتطبیق کے لیے ادب اور ذوق ہونا بھی از حد ضروری ہے، جس شخص میں ادب، ذوق اور فنی بصیرت نہ ہو، اسے علومِ حدیث کے استعمال کا حق نہیں پہنچتا۔ ادب اور ذوق نہ ہونے کے جو بھیانک نتائج ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ ایسا شخص، عوام (جن کا فہم، علل اور جرح وتعدیل کے حقائق اور دقائق کو سمجھنے سے قاصر ہوتا ہے، ان) کے سامنے بھی فنی امور بیان کرنے لگتا ہے، یہ بے ذوقی کی علامت ہے۔ امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ نے اہلِ مکہ کے نام اپنے خط میں لکھا تھا:

''وربّما كان في الحديث ما تثبت صحة الحديث منه، إذا كان يخفى ذلك علي، فربما تركت الحديث إذا لم أفقهه، وربما كتبتُه و بيّنتُه، وربما لم أقف عليه، وربما أتوقف عن مثل هٰذا؛ لأنهٗ ضررٌ على العامّة أن يكشف لهم كل ماكان من هٰذا الباب، فيما مضى من عيوب الحديث؛ لأن علم العامة يقصر عن مثل هٰذا.''

یعنی ''ممکن ہے کہ کسی حدیث میں ثبوتِ صحت کی علامات موجود ہوں، لیکن مجھ سے مخفی رہ گئی ہوں، تو ایسے موقع پر کبھی میں کسی حدیث کو تو سمجھ نہ پاؤں تو اسے ترک کردیتا ہوں، کبھی اسے کتاب میں لکھ کر اس کا اِسنادی حال (علت، وغیرہ) بھی بیان کردیتا ہوں، کبھی میں خود اس کے حال سے واقف نہیں ہوتا، اور کبھی حدیث کے متعلق علل کو کتاب میں درج کرنے سے توقف اختیار کرلیتا ہوں؛ کیوں کہ عوام کے سامنے کسی حدیث کی علتوں سے متعلق تمام فنی امور کو ظاہر کرنا نقصان دہ ثابت ہوتا ہے؛ اس لیے کہ ان کا علم ان امور کے اِدراک سے قاصر ہوتا ہے۔''

باوجود یکہ یہ کتاب' علماء کے لیے لکھی گئی تھی؛ لیکن پھر بھی امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ میں نے اس کتاب میں احادیث کی بہت سی علل اس لیے بیان نہیں کیں کہ وہ عام لوگوں کے فہم سے بالاتر ہیں۔

بدذوقی وبے ادبی کی ایک مثال

جن لوگوں کے دلوں میں مرض ہوگا، وہ تو جان بوجھ کر ایسا کام کریں گے؛ تاکہ لوگوں کے دلوں سے علومِ حدیث سے متعلق اعتماد اٹھ جائے۔ ایک شیعہ کی کتاب ہے: ''استقصاء الإفحام واستيفاء الانتقام''، یہ کتاب میں نے حضرت الاستاذ مولانا محمد عبدالرشید نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس دیکھی تھی، اس کا مصنف مولانا عبدالحی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے کا ہے، اور ''الرفع والتكميل في الجرح والتعديل'' (ص:۱۷۳) میں اس کا ذکر آیا ہے۔ اس شخص نے جرح وتعدیل کا اتنا غلط استعمال کیا ہے کہ اللہ کی پناہ! اس کے بقول: ''امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی روایت کا کوئی اعتبار نہیں، نعوذ باللہ؛ کیوں کہ امام بخاری کے بارے میں فلاں فلاں جرحیں ہیں!'' حالاں کہ یہ جرحیں خود مجروح اور باطل ہیں۔ طُرفہ یہ ہے کہ اس شخص نے جن لوگوں کے اقوال کی بنیاد پر امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ پر جرح کی ہے، بعد میں جب اسے انہی لوگوں پر جرح کی ضرورت پڑی تو ان پر بھی جرحوں کا انبار لگادیا اور استدلال میں خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کی جرح کو بھی نقل کردیا، یہ بے شرمی کی انتہا ہے!!

نااہل لوگوں اور عوام کے سامنے دقائقِ فن کے بیان سے پرہیز کرنا چاہیے

یہ انتہا درجہ کی بے ذوقی اور بے ادبی ہے کہ عوام کے سامنے ''جرحِ مجروح'' اور ''اعلالِ معلول'' کی بحثیں رکھ دیں۔

اعلالِ معلول: یعنی وہ اعلال جو معلول ہے، یعنی کسی محدث نے کہا کہ یہ معلول ہے، حالانکہ وہ معلول نہیں ہے، بلکہ اسے معلول کہنا معلول ہے، تو یہ اعلالِ معلول ہوا۔

جرحِ معلول: یعنی کسی نے جرح کی، حالانکہ وہ جرح خود غلط ہے، شرعی جرح نہیں ہے، تو یہ جرح خود مجروح ہوئی۔

بے ذوقی اور بے ادبی یہ ہے کہ عوام کے سامنے ''جرحِ مجروح'' اور ''اعلالِ معلول'' جیسی بحثیں رکھ دی جائیں، ایسے افراد کے لیے علومِ حدیث میں دخل دینا ناجائز ہے، بلکہ عوام کے سامنے ''جرحِ مجروح'' اور ''اعلالِ معلول'' کی بحثیں رکھنا تو ناجائز ہے ہی، ان کے سامنے تو وہ صحیح امور بھی پیش نہ کرنے چاہئیں جو دقیق ہیں، جیسے ماقبل میں امام ابوداود رحمۃ اللہ علیہ کی عبارت میں گزرا ہے۔ بعض لوگ اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ہیں، اور دقیق باتیں تو الگ رہیں، وہ تو عوام کے سامنے خرافات پیش کرتے ہیں۔ ذیل میں اس حوالے سے چند

واقعات ملاحظہ کیجیے:

❶ - ایک عامی کا واقعہ

ایک مجلس میں علماء، ضعیف روایت کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے، اور وہاں ایک عامی بھی موجود تھے، جو شاید ان علماء سے بے تکلف تھے، اس لیے انہوں نے ضعیف حدیث کے بارے میں اپنا خیال پیش کرتے ہوئے کہا: ’’میرے خیال میں جہاں تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی بات ہے تو ان کا ایمان بہت مضبوط تھا، ان کے لیے ضعیف حدیث نہیں چل سکتی تھی، ہم جیسے کمزور ایمان والوں کے لیے تو ضعیف حدیث بھی چل جائے گی!!‘‘ یہ واقعہ مولانا لطیف الرحمٰن بہرائچی نے ’’تحقیق المقال‘‘ (ص:۴۲) میں نقل کیا ہے۔ اب بتایئے! ایسے عوام، علمِ علل کے دقائق کو کیا سمجھیں گے؟!

❷ - حدیثِ احسن

میں جب ’’ریاض‘‘ سے تازہ تازہ ’’بنگلہ دیش‘‘ واپس آیا تو کافی عرصہ بعد اپنے گاؤں ’’کملاء‘‘ میں رہنے کا موقع ملا، ایک دفعہ مسجد میں ایک صاحب بیان کر رہے تھے اور موضوع روایات بیان کر رہے تھے، ان کے فارغ ہونے کے بعد مجھے خیال ہوا کہ تنبیہ کر دینی چاہیے کہ یہ روایات درست نہیں ہیں، لیکن ہمارے ان بھائی کو اچھا نہ لگا، وہ مجھ سے کہنے لگے کہ: ’’آپ مجھے کیا سمجھا رہے ہیں؟ مجھے معلوم ہے کہ حدیث کی قسمیں ہوتی ہیں: حسن، اور احسن!‘‘

❸ - ایک نواب صاحب کا واقعہ

ایک نواب صاحب، ایک مجلس میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ کے حوالے سے ایک طویل موضوع روایت بیان کر رہے تھے، شاید کتاب کے ترجمے کا مطالعہ کیا ہوگا۔ مجھے اندازہ ہوگیا کہ یہ منکر اور موضوع روایت ہے، اور ابنِ کثیر رحمۃ اللہ علیہ اس پر تبصرہ کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ: ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے یہ واقعہ ذکر کرنے کے بعد کچھ لکھا نہیں ہے؟ کہنے لگے: ’’موضوع لکھا ہے تو کیا ہوا؟! حدیث ہی تو ہے!‘‘ ایسے لوگوں کو آپ علومِ حدیث کے اصول کیسے سمجھائیں گے؟!

❹ - حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ

حافظ زین الدین عراقی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک استفتاء آیا کہ یہ حدیث کیسی ہے؟ انہوں نے بتایا کہ یہ موضوع ہے۔ تو ایک صاحب نے کہا کہ: ’’یہ تم کس سے فتوی لے آئے ہو؟ کون کہتا ہے کہ یہ

روایت، صحیح نہیں ہے، میرے پاس حدیث کی کتاب ہے، اس میں یہ حدیث لکھی ہوئی ہے'' اور پھر ابن جوزی رحمۃ اللہ علیہ کی ''کتاب الموضوعات'' سے روایت نکال کر دکھادی۔(فتح المغيث: ٢٩٤/ ١)

۵- شیخ کوثری رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

شیخ محمد زاہد کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے دمشق کی ایک مسجد میں خطیب صاحب کا بیان سنا، وہ ایک موضوع روایت بیان کرنے کے بعد بھرپور اعتماد کے ساتھ حدیث کا حوالہ دیتے ہوئے کہہ رہے تھے: ''رواه ابن الجوزي في الموضوعات!!'' یعنی یہ روایت میں اپنی طرف سے بیان نہیں کر رہا، بلکہ کتابوں میں یہ روایت موجود ہے، ابن جوزیؒ کی ''کتاب الموضوعات'' میں ہے۔(مقالات الکوثری، ص: ۲۴، البتہ اس کتاب میں شہر کا نام مبہم رکھا گیا، شہر کی تعیین مجھے شیخ عبدالفتاح ابوغدہ رحمۃ اللہ علیہ سے حاصل ہوئی) ایسے عوام اور جہلاء کو آپ جرح وعلل کیسے سمجھائیں گے؟!

الغرض علومِ حدیث کا صحیح اور معتدل استعمال سیکھنے کی ضرورت ہے اور یہ استعمال بغیر تفقہ کے ناممکن ہے۔ علومِ حدیث کا معتدل استعمال وتطبیق وہی کرسکتا ہے جس نے اس فن میں تفقہ حاصل کیا ہو اور فقهاء في الفن کی صحبت اُٹھائی ہو، اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے، آمین!

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

غصہ - ایک سماجی ناسور

نقصان اور علاج

مولانا عبدالمتین
لیاری، کراچی

اللہ رب العزت نے انسان کو پیدا فرما کر اس میں خیر و شر کے جذبات بھی پیدا فرمائے، تاکہ اس بات کی آزمائش کی جائے کہ انسان اپنے کون سے جذبے کو استعمال میں لاتا ہے اور ان پر کتنا قابو پاتا ہے۔ ان جذبات میں ایک ''غصہ'' بھی ہے۔ انسان میں دو عادتیں مرکزی کردار ادا کرتی ہیں: ①- پیٹ کی خواہشات، ②- غصے کے جذبات۔ قرآنِ کریم میں اللہ رب العزت ارشاد فرماتے ہیں:

''اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ''

(آلِ عمران: ۱۳۴)

''وہ لوگ جو تنگی اور خوشی میں خرچ کرتے ہیں اور وہ جو غصے کو پی جانے والے ہیں اور لوگوں کو معاف کرنے والے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔''

مذکورہ آیت میں غصے کے گھونٹ کو پی کر معاف کرنے کا رویّہ اختیار کرنے والے لوگوں کو اللہ رب العزت اپنا پسندیدہ بندہ قرار دے رہے ہیں۔ امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: اللہ رب العزت کو ہر طرح کے گھونٹ میں غصے کا گھونٹ پی جانا بہت پسند ہے۔'' (احیاء العلوم)

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک صحابیؓ مختصر نصیحت کی درخواست کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں: ''لَا تَغْضَبْ'' غصہ مت کر! غصے سے بچنے کی نصیحت کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ غصہ فقط ایک معاملہ نہیں؛ بلکہ غصہ اپنے اندر بہت سی برائیوں کا مجموعہ ہے؛ اسی لیے علمائے صوفیہ اسے ''اُم الامراض'' کا نام بھی دیتے ہیں۔ سیدنا محمد بن جعفرؒ فرماتے ہیں: ''غصہ ہر برائی کی چابی ہے۔'' (احیاء العلوم) کیوں کہ ایک ایسا مرض ہے جو بہت سی برائیوں کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور اس کی کوکھ سے بھی بہت سی برائیاں جنم لیتی ہیں، مثلاً: غصہ اس شخص کو زیادہ

آتا ہے جو تکبر، خود پسندی کے مغالطے میں مبتلا ہو، کوئی شخص کسی کو اپنے برابر یا اپنے سے بہتر سمجھ کر کبھی بھی اس پر غصہ نہیں کرتا۔

غصہ کی وجہ سے جنم لینے والی برائیاں

ویسے تو غصہ کی وجہ سے جنم لینے والی برائیاں بہت زیادہ ہیں جن میں گالم گلوچ، لڑائی جھگڑا اور مجبور ہونے کی صورت میں غیبت جیسی بیماریاں سر اُٹھانے لگتی ہیں۔ ہمارے ہاں غصے کو ایک ہوشیاری اور مہارت کے طور پر ذکر کیا جاتا ہے، مثلاً: یہ کہنا کہ مجھ سے ہر بات برداشت نہیں ہوتی، میں تو صاف منہ پر سنا دیتا ہوں، میں لحاظ وغیرہ نہیں کرتا، وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے جملے استعمال کر کے ہم سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی بہت بڑی بات کر رہے ہیں؛ حالاں کہ یہ سب شیطان کے ہتھکنڈے ہیں اور وہ ان جملوں کے ذریعے ہمیں غصے میں لا کر اپنے آلے کے طور پر استعمال کرتا ہے، جس کے نتیجے میں ہمارا اور ہمارے متعلقین کا نقصان ہو جاتا ہے۔

غصہ کا انسانی شخصیت پر اثر

غصہ صرف ایک عارضی حالت کا نام نہیں؛ بلکہ یہ بیماری شخصیت پر گہرے نقوش چھوڑتی ہے۔ امام غزالیؒ اس حوالے سے فرماتے ہیں: ''غصے کے وقت صورت بگڑ کر بھیانک بن جاتی ہے، ایسی صورت بنتی ہے جیسے کاٹنے والا کتا اور انسان اپنے مقام سے گر کر خونخوار درندہ بن جاتا ہے؛ جب کہ جو لوگ اپنے غصے پر قابو رکھتے ہیں، ان کی صورت علماء، اولیاء اور صالحین سے ملتی ہے۔'' (احیاء العلوم)

غصے میں انسان عقل مندی سے کم عقلی کا سفر پل بھر میں طے کر لیتا ہے۔ اسے پتا بھی نہیں چلتا جب کہ اس کی عقل کام نہیں کر رہی ہوتی ہے، گویا غصہ بے وقوفی کے سفر کو ایک رہنما کی طرح طے کرانے میں مرکزی کردار ادا کرتا ہے۔

حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ: ''جب تو غصہ کرتا ہے تو اُچھلتا ہے، قریب ہے کہ تو کہیں چھلانگ نہ لگا دے اور یہ چھلانگ تجھے سیدھا جہنم میں پہنچا دے۔''

حضرت سلیمان بن داؤد علیہ السلام اپنے بیٹے کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''بیٹا! زیادہ غصہ بردبار آدمی کو ہلکا کر دیتا ہے۔'' (احیاء العلوم)

معلوم ہوا کہ غصہ انسان کی شخصیت میں فقط ضد، جہالت، اَنا پرستی کا ذریعہ بنتا ہے۔

غصے کے اسباب اور اُن کا علاج

ذیل میں غصے کے علاج کے حوالے سے کچھ تجاویز پیش کی جاتی ہیں:

وہ غصہ جو ہمارے مزاج کا مستقل حصہ بن جائے، اس کے پیچھے کچھ اسباب ضرور ہوتے ہیں۔ ماہرین کے مطابق غصہ ایک ردِ عمل ہے جس کے اسباب میں ایک اہم سبب خوف کی کیفیت ہے اور خوف ہمیشہ نااہلی کی بنا پر پیدا ہوتا ہے، مثلاً: ایک شخص اپنی بیوی کے حقوق ادا نہیں کرتا تو وہ ہر وقت اس خوف میں مبتلا رہتا ہے کہ گھر میں کیسے جاؤں؟ قرضے کیسے ادا کروں؟ گھر میں جاؤں گا تو بے سکون ہو جاؤں گا؛ کیوں کہ بیوی ذمہ داریاں پورا نہ ہونے کے سبب سوال پر سوال کرے گی، بچوں کی فیس، علاج کا خرچ، گھر کا راشن تو وہ اپنی نااہلی کے سبب ایک خوف میں مبتلا رہے گا اور جب بھی اس کی بیوی مذکورہ کوئی بھی سوال اُٹھائے گی تو وہ اپنی نااہلی چھپانے کے لیے اور اپنے گھیرے جانے کے خوف سے غصہ کرے گا، جھگڑے گا، وغیرہ۔ ایسی صورت میں غصہ کا علاج اپنی نااہلی کو اہلیت میں بدلنے کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔

غصہ کا ایک سبب خود ساختہ تصورات ہیں، مثلاً خاندان، قبیلہ، رنگ، نسل کی وجہ سے ایک بلا وجہ کی بڑائی کا شکار ہو جانے سے غلط فہمی میں خود کو افضل سمجھنا، کسی کی معمولی بدسلوکی پر اپنی پہچان جتا کر غصہ کرنا۔ غصے کے حوالے سے سب سے پہلے یہ اصول سمجھنا ضروری ہے کہ غصہ انسانی خواہشات اور جذبات کا لازمی جز ہے؛ لہٰذا غصے کے علاج کے حوالے سے جو بھی علاج ذکر کیا جائے گا، وہ غصے کو قابو کرنے کے طریقے ہوں گے، نہ کہ ختم کرنے کے۔ رسول اکرم ﷺ کا مبارک ارشاد ہے:

’’لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرْعَةِ، إِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهُ عِنْدَ الْغَضَبِ.‘‘

(صحيح البخاري، كتاب الأدب، باب الحذر من الغضب، رقم الحديث: ٦١١٤)

یعنی: ’’پہلوان وہ نہیں ہے جو ایک ہی وار میں مقابل کو گرا دے؛ بلکہ حقیقی پہلوان وہ ہے جو عین غصے کے وقت اپنے اوپر قابو رکھے۔‘‘

دل اس بات کا شدّت سے تقاضا کر رہا ہو کہ اس کو کھری کھری سناؤں، تھپڑ رسید کروں، گالیاں دوں، اپنی بھڑاس نکال دوں، گھر والوں پر چیخ چیخ کر اپنی بڑائی جتاؤں، غرض اپنے ہاتھ پیر یا زبان کے استعمال سے اپنے کلیجے کو ٹھنڈک پہنچاؤں اور مجھے بظاہر کوئی روک ٹوک کرنے والا بھی نہیں۔ ٹھیک ایسی حالت کے دوران اپنے آپ پر قابو کرنا اور نظر انداز اور درگزر سے کام لینا، یہ واقعی بہت بڑے پہلوان سے بھی بڑھ کر طاقت ور بننے والی بات ہے۔

غصہ پر قابو پانے کا طریقہ

غصے کے علاج کے طور پر کچھ طریقے ہیں جو مستقل علاج کی حیثیت رکھتے ہیں، جن میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک طریقہ ارشاد فرماتے ہیں کہ: غصہ میں مبتلا شخص اپنے عیوب پر ہر حال میں نظر رکھے، اپنے

عیوب پر نگاہ رکھنے والا شخص ہمیشہ عاجزی اور اپنی اصلاح کی فکر میں مگن رہے گا اور اسے یہ فکر کبھی بھی اپنے مخاطب پر چڑھائی کرنے سے روکتی رہے گی، ان شاء اللہ!!

مزید ایک تجربے کی بات ارشاد فرماتے ہیں کہ: ’’غصہ قابو کرنا ہمیشہ مفید رہا ہے اور غصے کے تقاضے پر عمل کرنا ہمیشہ نقصان دہ ثابت ہوا ہے۔‘‘

یعنی ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی نے غصہ نہ کر کے شرمندگی اُٹھائی ہو؛ بلکہ ایسا شخص ہمیشہ اپنے اس فیصلے پر اطمینان کا اظہار کرے گا اور ایسا نہیں ہوا کہ کسی نے غصہ کر کے افسوس اور شرمندگی نہ اُٹھائی ہو، اس کا اندازہ معاشرے میں پھیلے بہت سے معاملات سے لگایا جاسکتا ہے، مثلاً: کاش! میں اس موقع پر اپنا ہاتھ روک لیتا، کاش! میری زبان گونگی ہوجاتی، میں اپنی زبان سے فلاں جملہ نہ کہتا، الغرض بہت سے تعلقات لین دین، رشتے، برادریاں، خاندان اس غصے کی عارضی کیفیت کی نذر ہوجاتے ہیں۔

طلاق کی شرح تیزی سے بڑھنے میں ’’غصہ‘‘ کا بہت بڑا حصہ ہے۔ تقریباً مرد حضرات غصے کی عین حالت میں معمولی تُوتُو مَیں مَیں کو طلاق کی نوبت تک پہنچا دیتے ہیں اور اکثریت بعد میں یہ کہتی پھرتی ہے کہ ہم نے غصے میں ایسا کیا ہے، اب ہم شرمندہ ہیں اور ہمیں کوئی طریقہ بتایا جائے؛ تاکہ ہم اپنی شریکِ حیات کو دوبارہ لاسکیں؛ لیکن:

اب پچھتاوے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت

غصے کو قابو کرنے کا ایک مفید علاج یہ بھی ہے کہ غصے کے دوران عذابِ الٰہی اور اللہ کی قدرت کو ذہن میں دہرائے، جیسا کہ روایت میں ہے کہ ایک بار حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ اپنے ایک غلام کو ڈانٹ رہے تھے تو آپ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ سے کہا: ’’لَلّٰہُ اَقْدَرُ عَلَیْکَ مِنْکَ عَلَیْہِ‘‘ ترجمہ: ’’اللہ تم پر اس سے زیادہ اختیار رکھتا ہے جتنا تم اپنے اس غلام پر رکھتے ہو۔‘‘ یعنی ہم جس پر غصہ کر کے اپنی بھڑاس نکال رہے ہوتے ہیں۔ وہ درحقیقت ہمارا اختیار ہوتا ہے، جسے ہم استعمال کرتے ہیں، اس سے بڑھ کر اختیار رب کو اپنے اس بندے پر ہے؛ لہٰذا ہم اگر اللہ تعالیٰ سے معافی، درگزر، لحاظ، چھوٹ اور رعایت کو پسند رکھتے ہیں تو لوگوں کے ساتھ بھی اپنے رویّے میں اس چیز کو پسند رکھیں۔

ایک اہم علاج یہ ہے کہ غصہ جس جگہ آ رہا ہے، وہاں سے فوری اتنا دور ہٹ جائیں کہ وہ شخص ہمیں نظر نہ آئے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ: غصے کا اصل سبب انسان کے جسم میں موجود حرارت کے مادّے ہیں اور حرارت کا سبب حرکت ہے، جتنی حرکت ہوگی یعنی جتنا زیادہ بولے گا، جواب دے گا، جتنا ہاتھ اُٹھائے گا، جتنا سوچے گا، انتقام کے جذبے کے سبب حرکت بڑھتی رہے گی اور جیسے ہی وہ اپنی جگہ بدل کر سکون میں آئے گا اور ایسی حرکات سے پرہیز کرے گا تو حرارت کم ہوگی، جس کے نتیجے میں غصے کے جذبات بھی کم ہوں گے، جس کے

لیے علماء مختلف مختصر علاج تجویز کرتے ہیں، مثلاً تکرار سے بچنا، جواب الجواب سے پرہیز کرنا، اس موقع پر کمرہ، گھر، دفتر یا اس مخصوص جگہ سے اتنی دور جانا کہ وہ شخص نظر نہ آئے اور گفتگو کا موضوع بدل جائے: وضو کرلینا، پانی پی لینا، تعوّذ پڑھ لینا، وغیرہ۔ یہ سب تجاویز جسم میں موجود اس حرارت کو مزید حرکت دینے سے روکنے میں مددگار ثابت ہوں گی۔ الغرض! غصہ آجائے تو اسے نظر انداز کرے اور اس موقع پر کوئی بھی چھوٹا بڑا فیصلہ کرنے سے گریز کرے اور غصے کو خود پر حاوی ہونے نہ دے، جس کی مثال ماہرین یوں بتاتے ہیں کہ جیسے خواب میں مجھے کوئی شخص گولی مار دے اور میں بے بس ہوکر تکلیف میں مبتلا ہوجاؤں تو اس موقع پر اس تکلیف سے بچنے کا سب آسان طریقہ یہی ہے کہ بیدار ہوجائے، جس کے بعد اس کی سب تکالیف ختم ہوجائیں گی۔

ایسے ہی غصہ ایک کیفیت ہے جس سے باہر نکل جانے کی صورت میں وہ کیفیت یکسر ختم ہوجاتی ہے۔

ایک اہم بات یہ ہے کہ غصہ کا دورانیہ ماہرین کے مطابق عموماً دس منٹ سے زیادہ نہیں ہوتا؛ لہٰذا کسی بھی طرح ان دس منٹ کو بہلا پھسلا کر کسی غلط فیصلے سے بچالے تو اگلے طویل دورانیہ تک اس کا فائدہ محسوس ہوگا۔

روزے کی حالت میں غصہ کے نقصانات

روزے کی حالت میں غصہ کے امکانات بہت بڑھ جاتے ہیں، کیوں کہ پورا دن بھوک پیاس اور خواہشات سے دور رہتا ہے؛ اس لیے طبیعت میں ایک طرح کی تیزی کا آجانا لازمی ہے؛ اسی لیے رمضان کو صبر کا مہینہ قرار دیا گیا ہے۔ یہ بھی دھیان رہے کہ ہم روزے میں جس صبر کی کیفیت سے دوچار ہیں، ہمارا ہر مسلمان مخاطب بھی روزے دار ہونے کی وجہ سے اس کیفیت میں ہوتا ہے۔ رمضان تو صبر، برداشت، غصے کو قابو کرنے اور اپنی تربیت کی مشق کا مہینہ ہے؛ اس لیے صوم کے لغوی معنی ہی احساس کرنا ہے، یعنی اپنے آپ کو نفسانی خواہشات سے روکنا۔ ایک روایت میں اس تربیتی طریقہ کار کو آپ نے رمضان کے پہلے خطبے میں ہی یوں بیان فرمایا:

’’ اَلصِّيَامُ جُنَّةٌ وَإِذَا كَانَ يَوْمُ صَوْمِ اَحَدِكُمْ فَلَا يَرْفَثْ وَلَا يَصْخَبْ فَإِنْ سَابَّهٗ اَحَدٌ اَوْ قَاتَلَهٗ فَلْيَقُلْ إِنِّي إِمْرُءٌ صَائِمٌ. ‘‘

حدیث مبارک میں روزے کو ڈھال سے تشبیہ دی گئی ہے، ڈھال ایک آلہ ہے جو جنگ میں حفاظت کے لیے ہوتا ہے۔ ایسے ہی روزہ بھی روزہ دار کی بدعملی، نافرمانی، گناہ اور عذاب کے کاموں سے حفاظت کرتا ہے۔ مزید تلقین کی کہ روزے کی حالت میں ہر طرح کی بے ہودگی سے بچا جائے؛ لیکن اکثر اوقات ایسا ہوتا ہے کہ بندہ خود ٹھیک ہوتا ہے؛ لیکن واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا ہے جو جنگ وجدال، گالم گلوچ پر اُتر آتے ہیں، فرمایا کہ: اگر کسی کا ایسے کسی شخص سے پالا پڑ جائے تو کہہ دو کہ: ’’میں روزے سے ہوں‘‘ میں معذرت چاہتا ہوں۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

تجدُّد پسندی کا فتنہ اور اس کے تازہ خدوخال

مولوی محمد احمد
متعلم درجہ سابعہ، جامعہ

زمانے کے اطوار جس طرح ایک جیسے نہیں رہتے، اسی طرح انسان بھی ایک جیسے نہیں رہتے۔ ہر صدی میں لوگوں کے مزاج، افکار اور رہن سہن کے طریقے بدلتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات نیک بندوں کی جگہ عاصی وخطاکار لے لیتے ہیں اور بعض اوقات تو گناہ گاروں کی جگہ مقربینِ الٰہی جلوہ افروز ہوجاتے ہیں۔ ہر دور میں اللہ تعالیٰ اپنے کچھ بندوں کو وہبی صلاحیتیں عطا کرتے ہیں، ایسی صلاحیتیں جو زندگی کے ان دوراستوں کو قبل از وقت نمایاں کردیتی ہیں، جن سے ہماری مابعد الموت کی زندگی کا پتا چلتا ہے، اب صاحبِ صلاحیت کے لیے انتخاب ہوتا ہے کہ یا تو وہ ہدایت کا راستہ چن کر فوز وفلاح سے سرفراز ہوجائے اور یا گمراہی کے دلدل میں پھنس کر ناکامی ونامرادی کا قلادہ پہن لے۔ اس زمانے میں کچھ لوگ صراطِ مستقیم کی راہ پکڑے ہوئے ہیں تو کچھ اپنی گمراہی کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کو بھی ضلالت کے گڑھے میں دھکیلنے کی کوشش کررہے ہیں۔

متجدّدین کا فتنہ

کوئی بھی فتنہ جب پروان چڑھتا ہے تو اس کے پیچھے کئی سارے راز پنہاں ہوتے ہیں۔ اس زمانے کے فتنہ پرور اور شرپسند لوگ متجدّدین کہلاتے ہیں، جن کو اس زمانے کے معتزلہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ لوگ ایسا فتنہ برپا کیے ہوئے ہیں جو احکاماتِ الٰہی اور معجزاتِ نبویہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو عقل کے ذریعے تسلیم کرنے اور ماوراء العقل کو پس پشت ڈالنے کی تعلیم دیتے ہیں۔ اس سے بڑھ کر فتنہ برپا اس وقت ہوتا ہے جب عوام بے لگام اس سامری فتنے کو بنی اسرائیل کی طرح پروان چڑھاتے ہیں۔

پس منظر

دراصل یہ فتنہ مغربی ممالک کی پیداوار ہے، جن کے ہاں یہ باور ہوہی چکا ہے کہ دینِ اسلام ایسا مقبول دین ہے جو انسان کی فطرت میں داخل ہے اور پوری دنیا میں بڑی سرعت سے پھیل سکتا ہے، چنانچہ اسلام دشمن

اس کو دبانے کی کوشش میں لگ گئے، اسی سلسلے میں مسٹر فرناؤ اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ: ''مسلم آبادی مشرق ومغرب کے وسط میں ہے جس وجہ سے ان کو حربی وجنگی استقامت حاصل ہے اور جو چیز ان میں کثیر الوقوع ہوگی وہ مشرق ومغرب تک پھیلے گی'' چنانچہ کہا گیا کہ دینِ اسلام کی اَساس قرآن وسنت کو مشکوک بنا کر ان میں تفرقہ ڈال دیا جائے، تاکہ یہ لوگ اپنی حدود تک محصور ہو کے رہ جائیں، اس سلسلے میں انہوں نے مختلف وار کیے۔

① - جس طریقے سے دین اسلام پھیلا تھا، اسی طریقے کو ملحوظِ خاطر رکھ کر مرزا غلام احمد قادیانی کو بطور نبی پیش کیا گیا، جس نے اسلام کے ہر حکم کو تبدیل کرنے کی کوشش کی، دین کی سربلندی کے لیے جہاد کو امن کے نام پر ختم کرنے کا حکم دیا، تاکہ اسلام کی مزید اشاعت نہ ہو اور فرائض وواجبات میں اختیار کا نظریہ دیا، تاکہ دین اسلام برائے نام رہ جائے۔

② - مسلم ممالک میں حرام چیزوں سے بنائی گئی مصنوعات پھیلائیں، تاکہ انہیں رزق میں بے برکتی کے باعث معاشی اعتبار سے کمزور کرسکیں۔

③ - مغرب نے سائنسی اصولوں کی بنیاد پر جس ''نئی تہذیب'' کی شجرکاری کی، وہ مذہب کے احکامات اور حدود کے بالکلیہ متضاد ہے، جسے آزادی اور روشن خیالی کا نام دیا جاتا ہے کہ آپ کسی کے حکم کے بھی ماتحت نہ ہوں، یہی نئی تہذیب پوری دنیا میں پھیلائی گئی، مسلم ممالک میں اسی نظام کے تحت ان کے سرکاری نظام میں مداخلت کرکے ایسا نظامِ تعلیم ترتیب دیا جس سے متجد دین کی ایک کھیپ وجود میں آئی جو قرآن وسنت سے زیادہ سائنسی علوم سے ماخوذ عقلی اصولوں پر بنائی گئی نئی تہذیب کے دلدادہ اور انگریزی تعلیم کے پروردہ تھے۔ اپنے اعتزال کے زہر کو اُمتِ مسلمہ میں پھیلاتے رہے اور ایسی باریک بینی دکھائی کہ اہلِ علم کا ایک کنبہ بنسبت جاہل کے قرآن وسنت چھوڑ کر عقل کے پہیے کے گرد گھومنے پر آمادہ ہوگیا۔

④ - اسکول، کالج اور یونیورسٹی کے نصاب کو ایسے طرز وطریقے سے ترتیب دیا جس سے دین اسلام کی پابندیاں عام ہوئیں اور تقلید کرنے والوں کو احکاماتِ الٰہی میں ذاتی اختیار رکھنے کی تعلیم ہوئی۔

ان سب کوششوں کا نتیجہ یہ نکلا کہ عقل ہی ان کے لیے مشعلِ راہ اور قابلِ تقلید بن گئی اور قرآن وحدیث اور معجزاتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام پر عمل اور اقرار ثانوی درجے کی چیزیں قرار پائیں، گویا عقل کو اصل کا درجہ دے کر قرآن وسنت کو بے اصل کہہ دیا گیا، العیاذ باللہ!

اُمتِ مسلمہ پر اس فتنے کے اثرات

اب لوگوں کا حال یہ ہے کہ قرآن وسنت کے احکام اور معجزاتِ نبویہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام میں جو بھی ماوراء

العقل بات سامنے آتی ہے توکھلم کھلا انکار کرتے ہیں کہ ان کو ہماری عقل قبول نہیں کرتی۔اسی طرح بعث بعد الموت، احوالِ میدانِ حشر اور دوزخ وجنت کومحض خیالی تصور قرار دیتے ہیں۔الأمان والحفیظ

متجددینِ زمانہ کی سیاہ کاریاں

چونکہ دینِ اسلام کی اَساس قرآن وسنت میں ہے، اسی تناظر میں انہوں نے قرآن وسنت پر متعدد وار کیے:

❶-قرآن میں تحریف کرنا: متجددین جب قرآن میں لفظی تحریف کرنے سے عاجز ہوئے تو معنوی تحریف میں لگ گئے اور بغیر کسی دلیل اور قرینے کے قرآن کے ظاہری اور حقیقی معنی کو چھوڑ کر غیر ظاہر معنی (جو ان کی عقل تسلیم کرتی ہے) مراد لینے لگے۔

❷-قرآن کی متشابہات کے پیچھے پڑنا: اہلِ سنت والجماعت کا یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کریم کی متشابہات کا علم سوائے اللہ کے کسی کے علم میں نہیں اور ان متشابہات سے جو بھی اللہ کی مراد ہے، ہمیں محض اس کے حق اور سچ ہونے کا اعتقاد رکھنے کا کہا گیا ہے اور جو شخص ان کے پیچھے پڑے گا، نہ تو اس کو خالص توحید حاصل ہوگی اور نہ ہی صحیح اور کامل ایمان، وہ شخص کفر اور ایمان کے درمیان متذبذب ہوجائے گا۔متجددین کا حال اس سے مختلف نہیں۔اپنے باطل نظریہ کی دلیل پیش کرتے ہیں کہ ایسا نہیں ہوسکتا کہ ایک چیز نازل ہوئی اور اس کی مراد اور مطلب کا کسی کو علم نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمادیا ہے: ’’وَمَا یَعْلَمُ تَأْوِیْلَهٗٓ إِلَّا اللّٰهُ‘‘ کہ میرے علاوہ ان تاویلات اور متشابہات کا علم کسی کو نہیں۔

❸-اسلام کی ریسرچ کا فتنہ: آج کل کے متجددین اسلام کے شرعی احکام کی ریسرچ کرنا چاہتے ہیں، تاکہ ان میں حددرجے شکوک وشبہات پیدا کرسکیں اور ان مسائل واحکام میں ایسی اختراعات داخل کردیں جو قرآن وحدیث میں بیان تک نہیں اور نہ ہی کسی صورت میں قرآن وحدیث ان اختراعات پر دلالت کرتے ہیں۔

❹-توہینِ قرآن: تمام غیر مسلم ممالک اسلام کی بنیاد کو منہدم کرنے اور اس کے خلاف پروپیگنڈہ کرنے میں شانہ بشانہ کھڑے ہیں۔آئے روز دینِ اسلام کی مقدسات کی بے حرمتی کرکے مسلمانوں کے ایمان کا احتساب کیا جاتا ہے اور جرأت اتنی کہ حکومتی سطح پر ہرزہ سرائی کی جاتی ہے۔کبھی حرمتِ رسول جیسی نازیبا حرکت کی جاتی ہے تو کبھی شانِ صحابہ رضی اللہ عنہم میں گستاخی کا ارتکاب کیا جاتا ہے اور جرأت اتنی کہ حکومتی سطح پر ہرزہ سرائی کی جاتی ہے، جب مغربی ممالک متجددین کے پس پردہ قرآنی احکام کی

مخالفت اور انکار کرکے دینِ اسلام کمزور نہ کر پائے تو نعوذ باللہ! وہ قرآن کریم کی توہین پر اُتر آئے اور اعلانیہ قرآن کریم کو نذرِ آتش کرنے لگے۔ جب عقل سے کچھ بن نہیں پاتا تو یہی بے ایمان خلافِ عقل کام کرنے لگ جاتے ہیں، یہ لوگ اللہ کی پکڑ سے دور نہیں، ضرور نشانِ عبرت بنیں گے۔

علمائے کرام کا سائنس کو قرآن سے ثابت کرنا

جیسا کہ معلوم ہو چکا کہ فتنۂ تجدُّد دپسندی مغرب کی شجرکاری کا عملی نمونہ ہے اور یہ فتنہ سائنسی علوم سے بنائی گئی مغرب کی نئی تہذیب سے پروان چڑھا، چنانچہ سانحہ یہ ہے کہ ہمارے بعض علماء نے ایسی تصانیف فرمائی ہیں، جن میں قرآن کریم کی روشنی میں سائنسی علوم کو ثابت کیا گیا ہے جو کہ قرآن میں شک پیدا کرنے والی بات ہے۔

حضرت مولانا سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے مضامین میں یہ واقعہ ذکر فرمایا ہے کہ ایک مرتبہ وہ مصر گئے تو وہاں کے بڑے عالم اور محقق سے ملاقات ہوئی، انہوں نے شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا کہ آپ نے میری تصنیف کا مطالعہ کیا؟ انہوں نے سائنسی اصول وقواعد کو قرآن سے ثابت کیا تھا، تو شیخ بنوری رحمۃ اللہ علیہ نے جواب میں فرمایا: جی! تصنیف کا مطالعہ تو ہوا، لیکن اس طرح کی تصنیف فرما کر آپ نے قرآن میں شک پیدا کر دیا جو آج نہیں تو کل ضرور ہوگا، اس لیے کہ سائنس کے اصول وضوابط ہمیشہ یکساں نہیں رہتے، ترقی کے ساتھ ان میں ردوبدل ہو جاتی ہے، آج آپ نے جن قواعد کو قرآن سے ثابت کیا، کل وہ قواعد کچھ اور ہوں گے اور آپ کا ثابت کیا ہوا کچھ اور ہوگا۔

فتنۂ تجدُّد دپسندی کا انسداد

مغرب نے جس شجرِ خبیث کو بویا اور جس نئی تہذیب سے فتنۂ تجدُّد دپسندی نے سر اُٹھایا، اب اس شجر خبیث کی جڑیں کاٹنے کی ضرورت ہے، تاکہ مغرب سے پھیلائی گئی شاخیں مرجھا کر نیست ونابود ہو جائیں، اس لیے کہ مغربی تہذیب لامذہب ہونے کے مترادف ہے، جس میں نہ حق تعالیٰ کی توحید کا اعتقاد ہے اور نہ ہی اس کے احکام کی پابندی اور نہ ہی اس کے برگزیدہ بندے انبیاء ورسل (علیہم السلام) کے وجود کا اقرار ہے، جو شخص بیک وقت (مذہبِ اسلام اور مغربی تہذیب) دونوں کشتیوں پر سوار ہونا چاہے گا، وہ مغربی تہذیب کا دلدادہ ہو جائے گا، حالانکہ مسلمان ہونے کے بعد شرعی حدود کی پاسداری ہی ایمان کی پہچان ہے۔

..... ❁ ..... ❁ ..... ❁ .....

معاشرہ میں عدل وانصاف

تقاضے اور اسلامی تاریخ

ڈاکٹر ساجد خاکوانی
اسلام آباد

اللہ تعالیٰ نے کل انسانیت کو ایک آدم علیہ السلام کی نسل سے جنم دے کر پہلے دن سے ہی سماجی انصاف کی بنیاد رکھ دی تھی۔ اسی بات کو قرآن مجید نے یوں بیان کیا کہ:

’’یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِیْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِیْرًا وَّنِسَآءً‘‘ (النساء:۱)

ترجمہ: ’’لوگو! اپنے رب سے ڈرو جس نے تم کو ایک جان سے پیدا کیا اور اسی جان سے اس کا جوڑا بنایا، اور ان دونوں سے بہت سے مرد وعورت دنیا میں پھیلا دیئے۔‘‘

اور اسی سماجی انصاف کو محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری خطبے میں یوں بیان کر دیا کہ تم سب ایک آدم علیہ السلام کی اولاد ہو اور آدم علیہ السلام مٹی سے بنے تھے، پس کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو کسی عربی پر کوئی فضیلت نہیں سوائے تقویٰ کے، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

’’یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّاُنْثٰى وَجَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ‘‘ (الحجرات:۱۳)

ترجمہ: ’’لوگو! ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا، پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنادیں، تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو، درحقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے زیادہ پرہیزگار ہے، یقیناً اللہ تعالیٰ سب کچھ جاننے والا اور باخبر ہے۔‘‘

مذاہب کی تقسیم میں بھی اللہ تعالیٰ نے کسی طرح کی تفریق سے کام نہیں لیا اور اپنی آخری

کتاب میں برملا اعلان کر دیا کہ:

’’اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ الَّذِیْنَ ھَادُوْا وَ النَّصٰرٰی وَ الصّٰبِئِیْنَ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَ عَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَ لَا خَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَ لَا ھُمْ یَحْزَنُوْنَ‘‘ (البقرۃ:۶۲)

ترجمہ: ’’بے شک ایمان والے ہوں یا یہودی ہوں یا عیسائی ہوں یا صابی، جو کوئی بھی اللہ تعالیٰ پر اور روزِ آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا اس کا اجر اس کے رب کے پاس محفوظ ہے اور اس کے لیے کچھ خوف اور غم نہیں۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی ایک صفتِ ازلی ’’عدل‘‘ ہے اور وہ رب کل کائنات کے ساتھ عدل کرنے والا ہے، چنانچہ انسانی معاشرے میں بھی مہلت عمل کے آغاز یعنی پیدائش تک اس عادلِ مطلق نے عدل کو انتہائی حد تک انسان کے اندر دخیل کیا ہے۔ بظاہر ایک طرف سے محرومی ہے تو دوسری طرف سے اس کا بہترین اِزالہ کر دیا، جیسے بینائی سے محروم کیا تو بے پناہ حافظہ عطا کر دیا، ذہنی صلاحیتیں کم تر ملیں تو جسمانی وجود کو قوت و طاقت سے بھر دیا، رنگت اور شکل وصورت میں مقابلۃً کمی بیشی کا شکار ہوا تو خاندانی وجاہت سے اس کمی کو پورا کر دیا، علیٰ ہٰذا القیاس، غرض قدرت کے ہاں سے کل انسان ایک عدلِ اجتماعی کا مجسم پیکر بن کر اس دنیا میں بھیجے گئے۔

انبیاء علیہم السلام نے جو تعلیمات انسانیت تک پہنچائیں، ان میں سماجی عدلِ اجتماعی کی ایک لحاظ سے مرکزی حیثیت رہی۔ محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم سے پہلی قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ جب ان کے چھوٹے (طبقے کے لوگ) جرم کرتے تو اُنہیں سزا دی جاتی اور جب ان کے بڑے (طبقے کے لوگ) جرائم کرتے تو اُنہیں چھوڑ دیا جاتا۔ جہاں جہاں انسانوں کے اس مقدس ترین طبقے کو اقتدار میسر آیا تو انہوں نے انسانوں کے درمیان عدل وانصاف قائم کیا اور ظلم وجور سے انسانی معاشروں کو پاک صاف کرتے چلے گئے۔ خاص طور پر محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم نے جس معاشرے کی بنیاد رکھی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کی قیادت میں اس کو تشکیل دیا، اس معاشرے کا تو خاصہ ہی سماجی عدل و انصاف ہے۔ نماز کے اندر پہلے آیئے پہلے پایئے کی بنیاد پر جگہ ملتی ہے، کسی خان صاحب، چوہدری صاحب، ملک صاحب یا پیر صاحب وغیرہ کے لیے کسی طرح کی مراعات نہیں ہیں، بس جو پہلے آئے گا وہ مقرب ومعزز جگہ پر مقام پائے گا اور جو دیر سے پہنچے گا وہ پچھلی صفوں میں کھڑا ہوگا۔ اسی طرح روزے میں بھی معاشرے کے سب طبقات اور تمام افراد کے لیے ایک ہی وقت پر روزہ شروع ہوتا ہے اور ایک ہی وقت پر اختتام پذیر ہوتا ہے۔ عدلِ اجتماعی کی ایک اور تاریخ ساز اور عہد آفریں مثال مناسکِ حج ہیں، جن میں صدہا سالوں سے ایک بڑے کے گھر میں سب چھوٹے کلیۃً معاشرتی عدل کے پیمانوں

کے مطابق مراسمِ عبودیت ادا کرتے ہیں۔ سیاست کے میدان میں محض اہلیت کی بنیاد پر سب طبقات کے سب افراد کے لیے کل مناصب کے دروازے کھلے ہیں۔ معیشت کے میدان میں حرام وحلال سب کے لیے برابر ہیں، معاشرت کے میدان میں صرف تقویٰ ہی معیارِ عزت وتوقیر ہے، وغیرہ۔

زکوٰۃ وصدقات سے سماجی انصاف کا قیام تو اظہر من الشمس ہے۔ امیر اور غریب کے درمیان فاصلے کم ہونے سے سماجی انصاف کی منزل بہت قریب آن لگتی ہے۔ آدھی رات کو امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے گھر کا دروازہ بجا تو سونے کی اشرفیوں سے منہ تک بھرا تھیلا پکڑے ہوئے شخص نے چارسو میل دور کا علاقہ بتاتے ہوئے کہا کہ وہاں سے یہ مالِ زکوٰۃ ساتھ لایا ہوں، قبول فرمائیں۔ امیر المومنین نے کہا کہ: اواللہ کے نیک بندے! کہیں بانٹ دیا ہوتا، مجھے دینے کے لیے یہاں کیوں پہنچ گیا ہے؟ آنے والے نے جواب دیا کہ خدا کی قسم سارے راستے آواز لگاتا رہا ہوں، لوگو! مالِ زکوۃ ہے، کوئی تو لے لو، لیکن اتنے طویل سفر میں کوئی زکوٰۃ لینے والا نہ ملا۔ زکوٰۃ وصدقات کی فراوانی کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کے وعدوں کی یہ تکمیل ہے کہ آدھی رات کو بھی حکمران کے دروازے پر کوئی دربان ونگران نہ تھا، چارسو میل تک نہ صرف یہ کہ کوئی چور ڈاکو نہ ملا، بلکہ کوئی مستحقِ زکوٰۃ بھی نہ تھا اور دیانت داری کا یہ عالم کہ صاحبِ نصاب نے وہ مال واپس بھی لے جانا مناسب خیال نہ کیا اور بیت المال میں جمع کرادیا۔

خلافتِ راشدہ میں محسنِ انسانیت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات اپنے بامِ عروج پر نظر آئیں۔ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے جس طرح کا سماجی عدل کا نظام عالمِ انسانیت کے سامنے پیش کیا، ویسا اس آسمان نے پہلے کبھی دیکھا اور نہ ہی شاید تا قیامت دیکھ پائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پہلے تو ماہانہ مشاہرہ لینے پر آمادہ نہ ہوئے، شورائیت کے نتیجے میں صرف اتنا وظیفہ قبول کیا جو ایک مزدور کی آمدن کے برابر تھا اور دم آخریں یہ وصیت کر گئے کہ جتنا کچھ وظیفہ کل دورِ خلافت میں وصول کیا، ترکے میں سے پہلے اس کی ادائیگی کی جائے اور پھر باقی ماندہ جائداد تقسیم کی جائے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت کل مؤرخین نے سنہرے حروف سے لکھا ہے، جب روم جیسی سلطنت کا سفیر یہ کہنے پر مجبور ہوا کہ تمہارا حکمران عدل وانصاف کرتا ہے اور بے غم سوتا ہے، جبکہ ہمارے حکمران ظلم وستم کرتے ہیں اور خوف زدہ رہتے ہیں۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے دنیا بھر کی تاریخ کی واحد مثال پیش کی کہ شہادت تو قبول کرلی، لیکن سرکاری اَفواج تک کو اپنی ذاتی حفاظت پر مامور نہ کیا، حالانکہ آپ وقت کے حکمران تھے۔ اور شیرِ خدا حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ جس تھان سے اپنے لیے کپڑا کٹواتے، اسی تھان سے اپنے غلاموں کے لیے بھی کپڑے کٹواتے تھے اور لوگ آقا اور غلام کو ایک ہی طرح کے کپڑوں میں دیکھ کر ششدر رہ جاتے۔

صرف تاریخِ اسلام نے ہی سماجی عدل وانصاف کو اپنے معاشروں میں جگہ دی کہ مسلمانوں

کے عروج سے قبل اور مسلمانوں کے زوال کے بعد پھر ایسی مثالیں انسانوں کے ہاں پیش نہ کی جاسکیں۔ کل انسانی تاریخ میں صرف مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں ہی ہندوستان میں خاندانِ غلاماں اور مصر میں مملوک خاندان کے لوگ برسرِ اقتدار آئے اور اس زمین کے سینے پر پہلی بار غلاموں کو اقتدار کے تخت پر براجمان دیکھا۔ ہندوستان میں خاندانِ غلاماں کے بادشاہان دراصل منڈی میں خریدے گئے غلام تھے اور اپنی قابلیت واہلیت کی بنیاد پر سیاست کے اعلیٰ ترین منصب پر فائز ہوئے اور جب ایک بادشاہ اس دنیا سے رختِ سفر باندھ چکتا تو اس کی اولاد کو بادشاہ بنانے کی بجائے عمائدینِ سلطنت کسی اہل تر فرد کو یہ منصب پیش کرتے، اور یوں یہ سلسلہ آگے کو بڑھ جاتا۔ سلطان محمود غزنویؒ کو ایک شہری نے شکایت کی کہ رات گئے ایک فرد زبردستی اس کے گھر میں گھس کر اس کی بیوی سے زیادتی کرتا ہے، بادشاہ نے کہا کہ اب جیسے ہی وہ تمہارے گھر آئے مجھے بلا لینا، رات گئے بادشاہ اس شخص کے ساتھ اس کے گھر میں دیوار پھلانگ کر داخل ہوا، کمرے میں داخل ہو کر پہلے چراغ گل کیا، پھر اس بدمعاش کا سر قلم کر دیا اور گھر والے سے کہا: فوراً مجھے پانی پلاؤ! اور پھر اس بدمعاش کی شکل دیکھ کر شکر الحمد للہ! کہا۔ گھر والے نے پوچھا: آپ گھر میں دیوار پھلانگ کر کیوں داخل ہوئے؟ بادشاہ نے کہا: دروازے کے راستے کمرے تک پہنچنے میں تاخیر ہو جاتی اور ممکن تھا کہ دروازے سے کھٹکا سن کر وہ بدمعاش فرار ہو جاتا۔ گھر والے نے پوچھا چراغ کیوں بجھایا؟ سلطان محمود غزنویؒ نے جواب دیا کہ: مجھے شک تھا، شاید یہ میرا بیٹا ہوگا، جس کے دماغ میں شہزادگی کا خمار اُسے اس بدمستی پر اُبھارتا ہو، روشنی میں شکل پہچان جانے سے انصاف کے درمیان شفقت پدری حائل ہو جاتی۔ گھر والے نے پوچھا: فوراً پانی کیوں مانگا؟ بادشاہ نے جواب دیا کہ: جب سے تم نے ظلم کی شکایت کی تھی، میں نے انصاف کی فراہمی تک اپنے آپ پر کھانا پینا حرام کر رکھا تھا۔ اور آخر میں اس نے پوچھا کہ: آپ نے شکر الحمد للہ! کیوں پڑھا؟ تو بادشاہ نے کہا کہ: وہ بدمعاش میرا بیٹا نہ تھا، اس پر میں نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ دورِ اقتدار اس طرح کی بے شمار مثالوں سے بھرا پڑا ہے، حتیٰ کہ فی زمانہ جب کل دنیا میں یہودیوں، عیسائیوں، ہندوؤں اور سیکولر افواج کے ہاتھوں مسلمان گاجر مولی کی طرح کٹ رہے ہیں، تب بھی کسی مسلمان ملک میں ان اقلیتوں پر انتقاماً دست درازی نہیں کی گئی۔

اس سے بھی کہیں زیادہ شاندار مثال حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کی ہے۔ مسلمان افواج نے بغیر کسی اطلاع کے آرمینیا فتح کرلیا۔ وہاں کے پادری نے ایک خط امیر المومنین حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ آپ کی افواج نے اسلام کی دعوت اور جزیہ پر آمادگی کی پیشکش کیے بغیر ہمارے شہر پر یلغار کر کے قبضہ کرلیا ہے۔ ہرکارہ جب دارالخلافہ میں وارد ہوا تو آدھی دنیا کا حکمران

اپنے گھر کی دیوار پر گارے کی لپائی کررہا تھا۔ خط پڑھ کر سیڑھی پر کھڑے کھڑے کاغذ کی پشت پر اسلامی فوج کے کماندار کے نام حکم نامہ لکھ دیا کہ فوج میں سے کسی عالم دین کو قاضی بنا کر اس معاملے کا فیصلہ کرو۔ خط ملتے ہی قاضی تعینات کردیا گیا، اس نے زوالِ آفتاب کے وقت فریقین کو طلب کرلیا اور پادری کے حق میں فیصلہ سنا کر سپہ سالار کو حکم دیا کہ غروبِ آفتاب سے قبل تمام سپاہیوں سے شہر خالی کروادیا جائے۔ سب سے آخر میں نکلنے والا فرد وہ قاضی تھا جو سختی سے نگرانی کررہا تھا کہ شہر خالی کرنے والے کسی سپاہی کے ہاتھوں کسی مقامی پر زیادتی نہ ہو۔ مؤرخین نے لکھا ہے کہ افواجِ اسلامی آرمینیا کی بستی خالی کررہی تھیں اور شہری ان کی چادریں پکڑ پکڑ کر کھینچ رہے تھے کہ تم ہی یہاں رہو اور حکومت کرو، کیونکہ ہمارے حکمران تو ہم پر ظلم کرتے ہیں۔ اسپین پر مسلمانوں نے آٹھ سو سال حکومت کی۔ یہاں پر مسیحی ملت ہمیشہ اکثریت میں رہی، ایک موقع پر شاہِ فرانس نے مسلمان اسپین پر حملہ کرنا چاہا تو اس نے یہاں کے ہم مذہب عیسائیوں پادریوں کو خط لکھا کہ میں باہر سے حملہ کروں گا، تم اندر سے میرا ساتھ دینا۔ تاریخ نگاروں نے لکھا ہے کہ مسیحی پادریوں نے اپنے ایک اجتماع میں یہ فیصلہ کرکے شاہِ فرانس کو خط میں جواب دیا کہ یہاں ہمیں مکمل معاشرتی، معاشی اور مذہبی آزادی میسر ہے اور ہمارے باہمی نزاعات کا فیصلہ بھی حکومت کی طرف سے مقرر کردہ مسیحی قاضی ہی کرتا ہے، چنانچہ محض حکمرانوں کی تبدیلی کے لیے ہم کسی کشت و خون میں تمہارا ساتھ نہیں دے سکتے۔

مسلمانوں کا ایک ہزار سالہ دور اس کرۂ ارض کے سینے پر سنہری الفاظ سے لکھا جانے والا دور ہے، جب از شرق تا غرب سماجی عدل کے تمام تقاضے بدرجہ اتم پورے کیے جارہے تھے۔ یہودیوں کی چار ہزار سالہ تاریخ میں ان کے لیے جو بہترین وقت تھا اسلامی دورِحکومت میں ہی اُنہیں میسر آیا۔ حضرت داؤد اور حضرت سلیمان علیہما السلام کے بعد ان کی اپنی دوریاستوں اسرائیل اور یہودیہ میں جنگوں کا جو طویل سلسلہ چلا اور ان میں جو بے پناہ خون جو بہایا گیا اس کی مثال بھی شاید مشکل ہو، لیکن بنی اسرائیل نے اپنی تاریخ کا بہترین وقت مشرق میں عباسیوں کا دورِحکومت اور مغرب میں اُمویوں کا دورِ حکومت تھا، جب ان کی تجارت عروج پر تھی اور بڑے بڑے تعلیمی ادارے اور طبی تربیت کے ادارے بھی ان یہودیوں کے زیرِنگرانی چل رہے تھے اور ان کو دربارِ شاہی تک براہِ راست دسترس حاصل تھی۔ ایک ہزار سالہ مسلمانوں کے دورِ اقتدار میں بڑی قوم نے چھوٹی قوموں کو سماجی و تعلیمی غلام نہیں بنایا تھا، ایک ملک سے دوسرے ملک میں جانے کے لیے سیروں وزن کے کاغذ نہیں اُٹھانے پڑتے تھے، حکمرانوں اور عوام کا بود و باش ایک ہی تھا، دولت اور اقتدار چند ہاتھوں یا کچھ مخصوص خاندانوں تک محدود نہیں تھے۔ ملوکیت اور خاندانی بادشاہت کے باوجود آج کے سیکولرازم سے کہیں بہتر حالات تھے،

جھوٹی شہرت بازی (پروپیگنڈہ) اور قوموں اور حکومتوں کو بلیک میل کرنے کا رواج نہیں تھا، بیک ڈور ڈپلومیسی کے نام پر عالمی منڈی میں اقوام کی خرید وفروخت کے بازار کہیں نہیں لگتے تھے، تعلیم اور علاج کے نام پر کاروبار نہیں چمکائے جاتے تھے۔ یہ سب سیکولر تہذیب، سرمایہ دارانہ نظامِ معیشت اور مغربی نظامِ جمہوریت کے مکروہ نتائج ہیں، جن کے باعث مسلمانوں کے قائم کردہ سماجی انصاف والے معاشروں کی جگہ آج پوری دنیا کے دریاؤں میں از شرق تا غرب پانی کی جگہ انسانی خون بہہ رہا ہے۔

ہندوؤں نے چار ذاتوں کی آڑ میں سماجی انصاف کو ذبح کردیا، بدھوں نے برما میں سینکڑوں نہیں، ہزار ہا مسلمان عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کا قتلِ عام کیا اور ان کی بستیاں اور املاک نذرِ آتش کیں اور مسلمانوں کی عبادت گاہوں تک کو نیست و نابود کرکے سماجی انصاف کا قلع قمع کردیا، عیسائیوں کے کسی فرقے کا پوپ آج تک ایشیا یا افریقہ سے نہیں آیا، حالانکہ اس مذہب کے اکثریتی پیروکاران دونوں براعظموں سے تعلق رکھتے ہیں اور صلیبی جنگوں وسقوطِ قرطبہ سے آج تک دامنِ صلیب انسانی خون سے رنگا رنگ ہے۔ یہودیوں نے تو انبیاء علیہم السلام جیسی ہستیوں کے بھی قتل سے دریغ نہ کیا تو باقی عدل وانصاف کے تقاضے وہ کہاں سے پورے کریں گے؟! جب کہ سیکولرازم تو ان سب سے بازی لے گیا ہے، جس نے بدترین اخلاقی وعلمی بددیانتی سے ان مذاہب کے عمدہ ترین تصورات کو چوری کرکے اپنے نام سے منسوب کرلیا ہے اور کذب ونفاق اور ظلم وستم کی وہ داستانیں رقم کی ہیں کہ الأمان و الحفیظ۔ انتہا تو یہ ہے کہ دیگر مذاہب بظاہر جو نظر آتے ہیں حقیقت میں بھی کم وبیش وہی ہوتے ہیں، جبکہ سیکولرازم انسانیت کا نعرہ لگا کر انسانوں کے خون سے ہولی کھیلتا ہے، جمہوریت کا نعرہ لگا کر آمریت کو مسلط کرتا ہے اور اسی طرح عدل وانصاف کا جھانسا دے کر ظلم وبربریت اور کشت وخون کا بازار گرم کرتا ہے۔ آلودگی کے نام پر معاشی جنگ، خاندانی منصوبہ بندی کے نام پر معاشرتی جنگ، حقوقِ نسواں کے نام پر بدکاری کا فروغ، ''چائلڈ لیبر'' کے نام پر خاندانوں کی بربادی، تعلیم کے نام پر جہالت بھری سیکولر تہذیب کا پرچار اور گلوبلائزیشن کے نام پر کل انسانیت کو تہذیبی وثقافتی غلامی کی زنجیروں میں ناک تک جکڑ لینا، اس سیکولرازم کا ننگِ انسانیت تاریخی کردار ہے۔ پس اب تو تاریخِ انسانی اس بات پر گواہ ہے کہ انسان نقصان میں ہے سوائے ان لوگوں کے جو ایمان لائے، نیک عمل کیے، حق بات کی نصیحت کی اور صبر کی تلقین کی۔ سماجی انصاف صرف ایک ہی صورت میں اس عالمِ انسانیت کا مقدر بن سکتا ہے جب قرآن وسنت کے اقتدار کا سورج مشرق سے طلوع ہوگا اور وہ وقت اب قریب ہی آن لگا ہے، ان شاء اللہ تعالیٰ!

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

بینک کی سودی رقم

کھانے پینے کے علاوہ دیگر ضروریات میں خرچ کرنے کا حکم

ادارہ

ایک آدمی (شوہر) نے اپنا پیسہ بینک میں جمع کرایا، جس پر اُسے ماہانہ آمدنی ملتی ہے، جس میں یقینی طور پر سود شامل ہوتا ہے، آدمی اپنی سودی آمدنی گھر کی مرمت، گاڑی کی مرمت، کار خریدنے کے معاملات میں استعمال کرتا ہے اور وہ اس سودی رقم کو کبھی بھی کھانے وغیرہ کے معاملے میں میز پر لانے کے لیے استعمال نہیں کرتا، اس رقم میں سے ایک پیسہ بھی کھانے پینے کی اشیاء میں استعمال نہیں ہوتا، لیکن صرف دیگر گھریلو سامان میں استعمال ہوتا ہے، اس کے پاس آمدنی کا ایک اور ذریعہ ہے جو بل ادا کرنے اور گھر کی مرمت وغیرہ کے لیے بالکل بھی کافی نہیں ہے، اس نے اس بات کو یقینی بنایا ہے کہ وہ بینک سے ملنے والی رقم کو کھانے پینے کی چیزوں سے متعلق کسی بھی چیز میں استعمال نہیں کرے گا، کیا ایسا کرنا جائز ہے؟ کیا سودی رقم بینک سے لینا صحیح ہے؟ یا وہ بینک سے سودی رقم بھی نہیں لے سکتا؟

الجواب باسمہٖ تعالیٰ

واضح رہے سود حرام اور ناجائز ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ساتھ اعلانِ جنگ ہے، سود خور پر اللہ تعالیٰ کا قہر و عذاب نازل ہوتا ہے، سودی اکاؤنٹ کھولنا اور سود کی رقم وصول کرنا حرام ہے، چاہے وہ رقم کسی بھی مد میں استعمال کی جائے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں مذکورہ شخص (شوہر) کے لیے بینک میں سودی اکاؤنٹ کھولنا اور اس سے سودی رقم لینا ناجائز اور حرام ہے، اس پر لازم ہے کہ سودی اکاؤنٹ ختم کرے، اور جتنی سودی رقم اس کے

اکاؤنٹ میں آ گئی ہے، وہ یا تو بینک کو واپس کرے یا واپسی کی صورت نہ ہو تو پھر بغیر ثواب کی نیت کے صدقہ کرے۔ اس رقم کو گھر کی تعمیر میں لگانا، گھر کی اشیاء خریدنا یا بل وغیرہ ادا کرنا یا کسی بھی طور پر استعمال میں لانا جائز نہیں۔ قرآنِ کریم میں ہے:

''اَلَّذِیْنَ یَأْکُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا یَقُوْمُوْنَ اِلَّا کَمَا یَقُوْمُ الَّذِیْ یَتَخَبَّطُهُ الشَّیْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْٓا اِنَّمَا الْبَیْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَیْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا'' (البقرۃ:۲۷۵)

ترجمہ: ''اور جو لوگ سود کھاتے ہیں، نہیں کھڑے ہوں گے (قیامت کے دن قبروں سے) مگر جس طرح کھڑا ہوتا ہے ایسا شخص جس کو شیطان خبطی بنا دے لپٹ کر (یعنی حیران و مدہوش) یہ (سزا) اسی لیے ہوگی کہ ان لوگوں نے کہا تھا کہ بیع بھی مثل سود کے ہے، حالاں کہ اللہ تعالیٰ نے بیع کو حلال فرمایا ہے اور سود کو حرام کر دیا ہے۔'' (بیان القرآن، ص:۱۹۸، ط: رحمانیہ)

وفیہ أیضاً:

''یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَأْکُلُوا الرِّبٰوٓا اَضْعَافًا مُّضٰعَفَةً وَّاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ'' (آل عمران:۱۳۰)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! سود مت کھاؤ (یعنی نہ لو اصل سے) کئی حصے زائد (کر کے) اور اللہ تعالیٰ سے ڈرو، اُمید ہے کہ تم کامیاب ہو۔'' (بیان القرآن، ص:۲۸۱، ط: رحمانیہ)

حدیثِ مبارک میں ہے:

''عن جابرؓ، قال: لعن رسول الله صلى الله عليه وسلم أكلَ الربا، ومؤكله، وكاتبه، وشاهديه، وقال: هم سواء.''(صحيح مسلم، باب لعن أكل الربا ومؤكله، ج:٥، ص:٥٠، رقم الحديث:١٥٩٨، ط: دار إحياء التراث، بيروت)

ترجمہ: ''حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سود کھانے (لینے) والے پر، سود کھلانے (دینے) والے پر، سودی لین دین لکھنے والے پر اور اس کے گواہوں پر سب ہی پر لعنت فرمائی ہے، نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: یہ سب (اصل گناہ میں) برابر ہیں۔''

فقط واللہ اعلم

فتویٰ نمبر: 144511102578 — دارالافتاء: جامعہ علوم اسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

..... ۞ ..... ۞ ..... ۞ .....

نَقدُ و نَظَر

ادارہ

رحمتِ عالم ﷺ

مصنف: حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ۔ صفحات: ۱۵۲۔ عام قیمت: ۴۶۰۔ ناشر: زمزم پبلشرز، شاہزیب سینٹر نز دمقدس مسجد، اردو بازار، کراچی۔ رابطہ نمبر: 0309-8204773

زیرِ تبصرہ مقبولِ عام کتاب رسولِ کریم ﷺ کی سیرت کے موضوع پر ہے۔ اس کے مصنف مشہور ومعروف عالمِ دین، مؤرخ، مصنف، نامور سیرت نگار حضرت مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ ہیں، جو سیرت کی ایک شہرت یافتہ کتاب ''سیرت النبیؐ'' کے شریک مصنف ہیں۔ ''سیرتِ نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام'' ایسا خوبصورت اور عظیم موضوع ہے کہ ایک مسلمان کو اپنے دین کے ساتھ جوڑنے اور دین کی اہمیت وعظمت دل میں پیدا کرنے کا بہترین اور مضبوط ذریعہ ہے۔ مشاہدہ اور تجربہ ہے کہ سیرت کا مطالعہ کرنے والوں کا دین سے رشتہ اور تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا جاتا ہے اور حضور اکرم ﷺ کی محبت وعظمت بھی دل میں راسخ ہوتی ہے، جو ایک مسلمان کے لیے ایسے ہی ضروری ہے جیسے زندہ انسان کے لیے سانس لینا۔ بہرحال زیرِ نظر کتاب ''سیرت'' کے موضوع پر ایک مختصر مگر جامع اور معتبر کتاب ہے، جو عام افراد، معمولی لکھے پڑھے ہوئے اور چھوٹے بچوں کے لیے عام فہم اُسلوب وانداز اور سادہ اور آسان زبان میں لکھی گئی ہے۔ کتاب حجم کے اعتبار سے مختصر ہونے کے باوجود سیرتِ نبویؐ کے اکثر اور اہم موضوعات کا اِحاطہ کرتی ہے۔

یہ کتاب پہلی مرتبہ آج سے تقریباً پچاسی سال قبل ۱۳۵۹ھ مطابق ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی اور اتنی مقبول ہوئی کہ دو چار سال میں اس کے کئی ایڈیشن ہزاروں کی تعداد میں شائع ہوکر ختم ہوگئے۔ کئی زبانوں میں اس کے ترجمے کیے گئے ہیں۔ ہندوستان کے سیکڑوں، ہزاروں مدارس، مکاتب اور اسکولوں میں داخلِ نصاب رہی ہے۔ یہ کتاب اس قابل ہے کہ گھروں میں اس کی تعلیم کی جائے، مدارس ومکاتب اور اسکولوں میں اسے داخلِ نصاب کرکے باقاعدہ پڑھایا جائے۔

زیرِ نظر ایڈیشن پاکستان کے معروف ناشر وطابع ''زمزم پبلشرز'' کا شائع کردہ ہے۔ کتاب کا کاغذ اعلیٰ ہے، کمپوزنگ اور سیٹنگ عمدہ ہے، ٹائٹل دیدہ زیب اور جلد بندی کارڈ کور پر ہے۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مصنف وناشر کو جزائے خیر عطا فرمائے اور قارئین کو استفادہ کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین